بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی وَعَلٰی آلِہٖ وَ صَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْہُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْباً مَفْرُوْضاً۔

علم میراث ان فقہی اور حسابی قواعد پر مشتمل علم ہے جس کے ذریعے کسی کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ اور حقوق کی پہچان اور ان کے حصوں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ یہ علم کتنا ضروری ہے اس کے جاننے کے لئے وہ احادیث شریفہ کافی ہیں جن میں اس علم کی فضیلت بیان کی گئی لیکن آج کل دین کی ضروریات میں سستی کا یہ عالم ہے کہ عام دنیاداروں کا تو ذکر ہی کیا بعض فارغ التحصیل علماء بھی اس علم کے ساتھ مناسبت نہ ہونے کا عذر کر کے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں حالانکہ ضروریات کے بارے میں فیصلہ ذوق کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی اہمیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو بھوک نہ لگے تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ اس کو کھانے سے رغبت نہیں ہے بلکہ اسے کھلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن میں علم میراث کا ذوق نہیں ان حضرات کو بار بار ان احادیث شریفہ کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ان میں ذوق پیدا ہو جائے۔ حضرت عمرؓ کی دور بین نگاہوں نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور فرماتے تھے کہ ﴿میراث قرآت اور سنت رسول اللہ ﷺ کے علوم کو اسی طرح ضروری سمجھ کر سیکھو جس طرح قرآن کو ضروری سمجھ کر سیکھتے ہو۔(2)﴾۔ علامہ قرطبیؒ اس علم کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں "اور جب یہ ثابت ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ فرائض کا علم صحابہؓ کے علوم میں سے ہے اور جن علوم پر ان کی نگاہ ہوتی تھی ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہا ہے لیکن بعد کے لوگوں نے اس کو ضائع کر دیا"۔

اس علم سے غفلت کا جو رونا علامہ قرطبیؒ رو چکے ہیں اس کی پیشن گوئی حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث شریف میں موجود ہے کہ ﴿حضور ﷺ نے فرمایا کہ فرائض سیکھو اور سکھلاؤ اس لئے کہ یہ نصف علم ہے اور یہ بھلا دیا جائے گا اور یہ پہلی شے ہے جو میری امت سے اٹھائی جائے گی (1)﴾۔ آج اس پیشن گوئی کو ہم پورا ہوتے دیکھ رہے ہیں لیکن ہماری یہ نااہلی ہے کہ حدیث شریف میں جو امر ہے اور جس کے ہم مکلف ہیں اس پر تو توجہ نہیں دے رہے ہیں اور جس چیز کی خبر ہے اور وہ تکوینی امر

ہے جس کے ہم مکلف نہیں اس پر مطمئن ہو چلے ہیں حالانکہ پیشن گوئی تو یہ بھی ہے کہ قیامت سے پہلے سارے لوگ کافر ہو جائیں گے تو کیا اس وجہ سے تبلیغ سے غفلت جائز ہو گی ؟ یہ بات بلاوجہ نہیں لکھی جارہی ہے بلکہ ایک مستند عالم کی روایت ہے کہ جب انہوں نے دوران طالبعلمی انتظامیہ سے علم الفرائض کے کورس کا مطالبہ کیا تو ان کو یہی پیشن گوئی سنائی گئی۔ مسلمان کا تو یہ کام ہے کہ اپنی سعی کو انتہا تک پہنچائے اور ثمرہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرے۔ اس علم کے ساتھ دو طرفہ زیادتی ہوئی۔ دینی مدارس میں حساب کی اہمیت کم ہو گئی جس کی وجہ سے اس علم کو بعض نے مشکل سمجھ کر عملاً ترک کر دیا اور سکولوں اور کالجوں میں حساب اگرچہ اعلیٰ درجہ کا پڑھایا جاتا ہے لیکن میراث کے قواعد نہ جاننے سے وہاں بھی اچھے اچھے دین دار حضرات اس علم سے محروم ہیں حالانکہ نہ تو اس کے قواعد مشکل ہیں نہ حساب۔ احقر نے ان قواعد کو دو چارٹوں میں ایسا جمع کیا ہے کہ صرف ان ہی دو چارٹوں سے میراث کے تمام سوالات حل کیے جاسکتے ہیں۔ سکول کے میٹرک کے طلبہ کو یہ دو چارٹ صرف پانچ گھنٹے میں سکھائے جاسکتے ہیں اور دینی مدارس میں اگر کسی کو صرف جمع تفریق ضرب تقسیم اور کسور کا حساب آتا ہو تو ان کو بھی صرف ایک دن میں اس کے ذریعے میراث کے سوالات کو حل کرنے کا طریقہ سکھایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ میراث کا حساب سیکھنے کے لئے ایک کتاب "میراث کا حساب" بھی لکھی ہے جس کی مدد سے الحمدللہ صرف دو دنوں میں میراث کا حساب سیکھا جاسکتا ہے فاین المشکل؟ ضرورت صرف اس علم کے اہمیت کے جاننے کی ہے۔

دینی مدارس میں صرف اس کے حساب کو جاننے پر اکتفا کرنا ایک قسم کی کم ہمتی ہے وہاں تو میراث کے مکمل علم کے سیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ دینی مدارس کے طلبہ ہی اس کے اصل اہل ہیں اس لئے بعض حضرات کی یہ رائے ہوئی کہ میراث کے تمام تر جزویات کے دلائل کو ایک کتاب میں جمع کیا جائے۔ میراث کا علم چند جزویات کو چھوڑ کر قرآن، سنت وراجماع سے ماخوذ ہے اس لئے یہ ارادہ ہوا کہ یہ کتاب ایسے انداز میں لکھی جائے کہ سب سے پہلے اس کے جو مسائل قرآن سے لئے گئے ہیں ان کو قرآن کی مستند تفاسیر کی روشنی میں طلبہ کو سکھایا جائے اور جہاں جہاں قرآن کے اجمال کو سنت کی تفصیل نے واضح کیا ہے وہ احادیث شریفہ اور آثار صحابہؓ طلبہ کو بتائے جائیں اور جہاں جہاں اجماع منعقد ہوا ہے اس کی وضاحت کی جائے اور جن امور پر

ہوا ہے مثل تخارج و میراث حمل وغیرہ کو سمجھایا جائے اور ان میں اگر اختلاف ہے تو اس میں ہر امام کا مسلک بیان کیا جائے۔ قرآن کی آیات مبارکہ کی تشریح بالکل تفسیری انداز میں اور احادیث شریفہ سے ثابت شدہ جزویات کو بالکل درس حدیث شریف کے انداز میں پڑھایا جائے تو انشاء اللہ اس کتاب سے دورۂ تفسیر اور دورۂ حدیث کے طلبہ بھی بہتر انداز میں استفادہ کر سکیں گے۔ جب ان جزویات کے مآخذ اچھی طرح سمجھ میں آجائیں تو پھر حسابی قواعد کو آسان انداز میں سمجھانے کیلئے احقر کی کتاب " میراث کا حساب " انشاء اللہ کافی رہے گا۔ اس کتاب کے آخر میں الاربعین فی المیراث بھی دی گئی ہے اس میں میراث کے بارے میں چالیس مختصر ترین احادیث دی ہوئی ہیں۔ ان کی فضیلت سے علماء کرام خوب واقف ہیں اس لئے ہمارے اکابر نے مختلف عنوانات سے اربعین کے کئی مجموعے مرتب فرمائے ہیں پس ایک تو یہ علم خود ایک انتہائی مقبول اور مطلوب علم ہے جیسا کہ اس کی فضیلت کی احادیث سے ظاہر ہے اور دوسرا اس کے ساتھ اربعین کی فضیلت۔ اللہ تعالیٰ اپنی فضل سے ہمیں یہ نصیب فرمائے۔

حوالوں کا طریقہ بہت سادہ رکھا گیا ہے۔ اگر قرآن کے آیت سے استنباط کی گئی ہے تو وہیں وہ آیت بھی لکھ دی گئی ہے البتہ اگر حدیث شریف سے استنباط کی گئی ہے تو اس کا مطلب ضرورت کی جگہ پر لکھ کر قوسین میں اس کا حوالہ نمبر دیا گیا۔ اس نمبر پر انشاء اللہ وہ حدیث شریف مکمل متن کے ساتھ موجود ہو گی۔ اور اگر حوالہ کسی کتاب کا ہے تو حوالہ نمبر کے مطابق وہاں اپنے نمبر پر اس کا نام دیا گیا ہو گا اور اگر یہ حوالہ کسی کتاب سے دیا گیا ہے تو اسی نمبر پر اس کتاب کا حوالہ نمبر دیا ہو گا مثلاً کسی جگہ 50 لکھا ہوا ہے تو حوالوں کی فہرست میں دیکھیں اگر حدیث شریف لکھی ہے تو اسی کا حوالہ ہے اگر کسی کتاب کا نام ہے تو اس کا حوالہ ہے اور اگر کتاب کا نام بھی ہے لیکن اس کے سامنے کوئی اور نمبر مثلاً 7 لکھا ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہی کتاب حوالہ ہے لیکن براہ راست نہیں بلکہ نمبر 7 پر جس کتاب کا نام ہے اس کے حوالے سے۔

اس طریقے میں ان شاء اللہ کئی خوبیاں جمع ہو جائیں گی۔ مثلاً اس کے ذریعے اصول فقہ طلبہ کو خود بخود سمجھ میں آجائے گا اور جن طلبہ نے اصول فقہ پہلے پڑھا ہو گا ان کے علم کا گویا کہ اس میں اجراء ہو جائے گا دوسرا یہ کہ جس طالبعلم نے میراث اس طریقے سے پڑھی اس کا علم قرآن کی آیت میراث کی تلاوت سے تازہ ہو گا اور اگر وہ بھول چکا ہو تو دوبارہ اس کو یاد آجائے گا کیونکہ یہ قرآن کا ہی اعجاز ہے کہ چند آیات میراث میں اس

اہم علم کو ایسا سمویا ہے کہ ان آیات کی باہمی ترتیب اور متعلقہ احادیث شریفہ و آثار صحابہ کے قاری کو کچھ اندازہ ہو تو ان آیات ہی سے سارا علم سمجھ میں آسکتا ہے۔ علامہ قرطبیؒ تبھی تو لکھتے ہیں:

''یعنی یہ آیات علم الفرائض کے احکام کی بنیاد ہیں اور ان میں فرائض کے سارے گوشوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔'' اس کتاب کے لکھنے میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ اب تک جتنی کتابیں میراث پر لکھی جاچکی ہیں ان سب سے استفادہ کیا جائے کیونکہ ہر عالم کے پاس کوئی نہ کوئی منفرد پھول ہوتا ہے پس ان تمام پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ بنایا جائے کہ ان تمام شاہکاروں کو دیکھنے کی جن کو فرصت یا وسعت نہ ہو وہ ان سے محروم نہ رہیں مثلاً تفسیر مظہری نے قانونی نکات کو بہت اچھے طریقے سے لکھا ہے تو اعلاء السنن کی اٹھارویں جلد تقریباً آدھی میراث پر ہے میں ان احادیث شریفہ کا ذخیرہ ہے جس سے میراث کی جزویات میں استنباط کیا گیا ہے۔ ابو بکر جصاصؒ کی احکام القرآن میں قرآن کی آیات سے فقہی استنباطات کا خزانہ ہے تو مفید الوارثین میں علم میراث کو آسان کرنے کا جذبہ نمایاں ہے۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہ کے ہاں اختصار مگر جامعیت ہے تو ان ہی کے ایک مسترشد مفتی جہانگیر صاحب مدظلہ کے ہاں میراث کے لئے آسان قواعد کی فراہمی کی کوشش۔ بعض جدید عربی کتابوں میں مذاہب اربعہ کی زیادہ تفصیل موجود ہے جو کہ اہل ہند کی کتابوں میں مشکل سے ملتی ہے اس لئے ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ اگر ہمارے طلبہ دوسرے ممالک میں دینی خدمات انجام دینے لگیں یا دوسرے ممالک کے علماء اکرام کے ساتھ ان کو کوئی دینی کام مل کر کرنا پڑے تو اس ضروری علم میں ان مذاہب اربعہ کے دلائل کا بالتفصیل علم ہو اگرچہ مقلد کو تو اپنے امام کی ہی تقلید کرنی پڑتی ہے لیکن علم تو سب کا مشترکہ ورثہ ہے اور سب کے دلائل جان کر اپنی فقہ پر عمل کرنا سلف صالحین کا طریقہ ہے۔ ان سب کے ساتھ السراجی جو کہ احناف کے ہاں میراث کا متن ہے اس کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے اس سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تمام کوشش کو قبولیت سے سرفراز فرما کر امت مسلمہ کے لئے نافع بنائے۔ مناسب ہے کہ یہ کتاب دورۂ حدیث کے طلبہ کو پڑھائی جائے اور اس کے بعد احقر کے چارٹوں کے ذریعے میراث کے سولات کو حل کرنے کی مشق کرائی جائے۔ اس کے لئے امید ہے کہ پانچ دن کافی رہیں گے۔ اس کے بعد کوئی بھی طالب علم اپنے علم کو جتنا

میں ان شاء اللہ بفضل تعالیٰ یہ کافی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس علم سے ہم سب کو بہرہ ور فرما کر اس پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازے اور ہر قسم کے مواخذے سے ہم سب کو محفوظ فرمائے۔

آمین یارب العالمین۔

سید شبیر احمد کاکاخیل

مدیر فنی امور عالمی ادارہ تسہیل الحسابات الاسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِینُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مِنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارِكْ وَ سَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ عَنْ عَبْدَ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ بْنَ الْعَاصِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ أَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ وَ مَا سِوٰی ذٰالِكَ فَھُوَ فَضْلٌ آیَةٌ مُحْکَمَةٌ أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ أَوْ فَرِیْضَةٌ عَادِلَةٌ "

(حضرت عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ " ضروری علوم تین ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے علوم ان پر اضافہ ہے۔ وہ آیت قرآنی کا سیکھنا، جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کو حاصل کرنا اور سراپا عدل وانصاف علم میراث کا حاصل کرنا ہے"۔

علم الفرائض (میراث) کے اکثر احکام براہ راست وحی متلو یعنی قرآن سے ثابت ہیں اس لئے اس میں آئمہ کرام کے درمیان اختلاف بہت ہی کم ہیں اور اکثر مسائل پر اتفاق ہے۔ سورۃ نساء کی چند آیات مبارکہ میں انتہائی جامعیت سے میراث کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی ابتدا میں فرمایا

"لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْہُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْباً مَّفْرُوْضاً " (النساء آیت نمبر7)

اس آیت مبارکہ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے جس سے قریش کا معاشرہ تو کیا، تمام عالم انسانیت آشنا نہیں تھا اور عورتوں کو میراث میں حق دینے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن اس میں یہ وضاحت کھل کے کی گئی کہ جس طرح مردوں کا حصّہ ان کی اقربا اور والدین کے ترکہ میں مقرر ہے اس طرح عورتوں کا بھی۔ یہی آیت ہے جس نے وصیت کی آیت

﴿ کُتِبَ عَلَیْکُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْراً الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ و الاقربون بالمعروف حقاً علی المتقین البقرۃ آیت نمبر180 ﴾

کو نئی شکل دے دی اور جس وصیت کا اختیار انسان کو دے دیا گیا تھا انسان میں اس کی صلاحیت مفقود ہونے کی وجہ سے واپس لے لی گئی اور اللہ تعالیٰ کے امر نے "یوصیکم اللہ فی أولادکم" میں لفظ وصیت کے روپ

میں اس کمی کو پورا کیا اور اب انسان کے لئے یہی حکم ہے کہ میراث کے احکام والی آیات پر من و عن عمل کے لیئے تیار ہو جائے۔ اگر کوئی ان آیتوں کو یاد کرلے تو میراث کا نصف سے زیادہ علم اس کے لئے حاصل کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ﴿اے ابو ہریرہؓ! تم فرائض (علم میراث) سیکھو اوا سے لوگوں کو سکھلاؤ اس لئے کہ وہ نصف علم ہے۔ اوراس کو بھلا دیا جائے گا، اور میری امت سے یہی علم سب سے پہلے سلب کیا جائے گا(1)﴾ اور اگر ان چند احادیث شریفہ کو بھی جن میں ان آیات مبارکہ کی تشریح ہے یاد کرلیا جائے تو پھر تو نورٌ علیٰ نورٌ۔ پھر تو علم میراث کو یاد رکھنا اور اس کو استعمال میں لانا کوئی مشکل ہی نہیں رہے گا۔ اس ضرورت کے پیش نظر چالیس احادیث شریفہ بھی ضمیمہ میں شامل کی گئی ہیں تاکہ ان کو یاد کیا جاسکے۔ چالیس احادیث شریفہ کو یاد کرنے کی الگ فضیلت ہے اسلئے علمائے کرام نے مختلف موضوعات پر چالیس احادیث شریفہ کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک موقع پر فرمایا کہ فرائض، لحن اور سنتوں کا علم ایسا سیکھو جیسا کہ تم قرآن سیکھتے ہو(2)۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ علم فرائض سیکھو کیونکہ یہ تمھارے دین سے ہے(3) حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے بھی ایک موقع پر فرمایا کہ قرآن اور علم الفرائض سیکھو کیونکہ عین ممکن ہے کہ کوئی اس علم کا محتاج ہو جائے جس کو وہ جانتا تھا یا وہ ایسی قوم میں رہے جو اس علم کو نہ جانتے ہوں (4) ۔ اس طرح حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا کہ جو قرآن جانتا ہے لیکن علم فرائض نہیں جانتا اس کی مثال ایسے سر کی ہے کی ہے جس کے لئے چہرہ نہیں یا اس کا چہرہ نہیں۔(5)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ علم فرائض، طلاق اور حج کے مسائل سیکھو کہ یہ تمھارے دین میں سے ہیں۔(6)

حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ہمارے وقت میں لوگ قرآن، علم الفرائض اور علم المناسک کے حصول میں رغبت کرتے تھے(7)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن پڑھا تو وہ علم الفرائض سیکھے۔ اگر آپ سے کوئی اجنبی ملاقات کرتا تو آپ پوچھتے کہ اے مہاجر کیا تو قرآن کا قاری ہے اگر اس نے کہا کہ ہاں تو پوچھتے کیا تو علم فرائض جانتا ہے تو اگر وہ کہتے کہ ہاں تو آپ اس کو زیادتی اور خیر (یعنی پسند) فرماتے اور اگر وہ کہتے کہ نہیں! تو آپ اس سے کہتے کہ آپ کو مجھ پر کیا فضیلت ہے۔(8)

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم علم سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ اور تم علم فرائض سیکھو اور اس کو لوگوں سکھلاؤ اور تم قرآن سیکھو اور اس کو دوسروں کو سکھاؤ کیونکہ میں وفات پانے والا ہوں اور علم عنقریب معدوم ہونے والا ہے۔ اور بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے حتیٰ کہ دو شخص ترکہ کے کسی مسئلہ میں جھگڑا کریں گے اور ان کو کوئی ایسا عالم دستیاب نہ ہوگا جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے۔(9)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے سکھ اور چین کے لئے میراث کے ضابطے بنائے اور اس میں ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا اب وارث کے لئے وصیت نہیں۔(اربعین نمبر 1)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہمیں اس جستجو میں نہیں رہنا چاہیے کہ کس کے لئے ہم مال چھوڑیں اور کس کو نہ دیں اب تو ہمارے لئے صرف اتنی اجازت ہے کہ مرض الموت میں صرف ایک تہائی تک وصیت کرسکتے ہیں اور وہ بھی غیر وارث کے لئے۔ اس سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں بلکہ اس سے کم کی وصیت کرنا مستحسن ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہونا ہے اور خدانخواستہ اگر کوئی بدبخت اس کا الٹ سوچ کر وارثوں کو ضرر پہنچائے تو اس کو مسند احمد اور ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی اس حدیث شریف کو سامنے رکھنا چاہیے جس میں رسول کریم

ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿بعض عورتیں اور مرد ساٹھ سال (یعنی عمر بھر) اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت کرتے ہیں پھر موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں وارثوں کو ضرر پہنچاتے ہیں (مثلاً اپنے کسی پسندیدہ وارث کو کسی طریقے سے زیادہ دے جاتے ہیں یا کسی ناپسندیدہ وارث کو محروم کر دیتے ہیں یا کسی غیر وارث کو فقط اپنے ناپسندیدہ ورثاء کو محروم کرنے کے لئے دے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ) اسی وجہ سے دوزخ ان کے لئے واجب ہو جاتی ہے۔(10)﴾۔

اسی طرح جو لوگ میراث کو تقسیم نہیں کرتے اور اس میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں ان کے اس فعل کی کلام الٰہی اور احادیث شریفہ میں شدید مذمت آئی ہے کاش ان سے کوئی سبق سیکھ کر اپنے آپ کو اس عذاب عظیم سے بچائے۔ میراث میں یتیموں کا بھی حصہ ہوسکتا ہے ان کے مال میں ناجائز تصرف کو اللہ تعالیٰ جس عنوان سے سورۃ نساء میں بیان فرماتے ہیں اس کے سننے سے دل کانپ جاتا ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا " ( بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔نساء) اور اگلی آیتوں میں میراث کے احکام بیان کرنے کے بعد کس شان سے ان احکام پر عمل کرنے والوں کو بشارت سنائی جارہی ہے اور عمل نہ کرنے والوں کو وعید، ذرا اس کو بھی ہم پڑھیں۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿ یہ سب احکام مذکورہ اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔(النساء آیت نمبر 13)اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا اس کو آگ میں داخل کردیں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا دی جائے گی جس میں ذلت بھی ہو گی۔ (النساء14) ﴾

جو لوگ میراث کا مال بے دریغ کھاتے ہیں ان کو سورۃ فجر میں بتایا جارہا ہے کہ ان کے اس عمل کا احکم الحاکمین کو پتہ ہے اور وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿ اور تم لوگ میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔(الفجر) ﴾

میراث میں جائیداد اور زمینوں کی تقسیم بھی ہوتی ہے اور اس میں دھوکہ اور ظلم کرنے والوں کو اس وقت احساس نہیں ہوتا کہ ہم یہ ظلم مظلوموں پر نہیں بلکہ خود اپنے اوپر کر رہے ہیں وہ ظلم کیا ہے اس کے بارے میں ان کو حضرت سعید بن زیدؓ کی وہ روایت سامنے رکھنی چاہیے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿ جس شخص نے کسی کی زمین سے ظلماً ایک بالشت جگہ لی اس کو قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔(11) ﴾ قیامت کے ہولناک دن میں سب کے سامنے کسی کا یہ حشر ہو جائے تو وہ کیا محسوس کرے گا اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس مصیبت سے بچائے۔ آمین ثم آمین۔

اب سب سے پہلے ان آیات مبارکہ کی مختصر تفسیر نمبر وار لکھی جاتی ہے۔ یہ تفسیر بیان القرآن سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد ان سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں مستند تفاسیر جن میں حضرت ابو بکر جصاصؒ کی احکام القرآن، حضرت مفتی محمد شفیعؒ کی معارف القرآن اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری کے علاوہ کئ

اور تفاسیر سے مدد لی گئے ہے۔ بیان القرآن کی مختصر تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ عبارت اگر مکمل اور مسلسل پڑھی جائے تو یہ ترجمہ بمع تفسیر ہو گا لیکن کلام الٰہی کے ترجمہ کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے جس کا بر قرار رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور جن کو کسی موضوع پر تحقیق کرنی ہو اس کے لئے ترجمہ اور تفسیر کا علیحدہ علیحدہ سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ کلمات الٰہی اور کلمات انسانی آپس میں گڈ مڈ نہ ہو جائیں۔ اس کے لئے حضرتؒ نے تفسیری کلمات کو قوسین کے اندر رکھا ہے کہ اس سے ترجمہ کی تشریح کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ترجمہ و تفسیر میں فرق بھی باقی رہے۔ البتہ تسلسل کو بر قرار رکھنے کے لئے اس کو ایسی جگہ رکھا ہے کہ اگر مسلسل پڑھا جائے تو کسی ابہام کے بغیر کلام الٰہی کا مفہوم آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَ الاَقْرَبُوْنَ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِیبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَ الاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ نَصِیباً مَفْرُوْضاً " (النساء آیت نمبر 7)

مردوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت ہی نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں، اور (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (عورتوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں خواہ وہ (چھوڑی ہوئی) چیز
قلیل ہو یا کثیر ہو (سب میں سے ملے گا) حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مقرر ہے۔

فائدہ۔

1۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو میراث (ترکہ) کا حق دار بنایا ہو اسے وہ حق پورا پورا دینا چاہیے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اور ترکہ قلیل ہو یا کثیر۔ اس میں جاہلیت کے دور کی اس غلط رسم کی تغلیط ہو گئی جو میراث کو صرف ان مردوں کے لئے خاص سمجھتے تھے جو لڑائی لڑسکتے تھے۔ اس آیت میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ میراث میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے اور ان میں چھوٹے بڑے کی تخصیص بھی نہیں۔ اس آیت سے عورتوں کا حصہ تو ثابت ہو گیا تھا لیکن اس کا اندازہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کتنا ہے؟ اس کا علم پھر اگلی آیتوں کے نزول سے ہوا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اس آیت کو علماء نے میراث میں چھوٹے گھروں غسل خانوں وغیرہ جن کی تقسیم سے ان کا نفع ختم یا کم ہوتا ہو کو تقسیم کرنے یا نہ کرنے کا مستدل بھی بنایا ہے۔ علامہ قرطبی کے مطابق امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں تقسیم لازمی ہے چاہے ضرر بھی ہوتا ہو اور اسی کے مطابق امام شافعیؒ، ابن کنانہؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول بتایا ہے البتہ ابن ابی لیلیٰ، ابو ثور اور ایک قول کے مطابق امام مالک رحمھم اللہ کی رائے ضرر کی صورت میں نہ کرنے کی بتائی ہے۔ البتہ جس کی تقسیم میں ضرر نہ ہو ان کی تقسیم میں تو کم از کم یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ تھوڑی ہے اس کے تقسیم سے کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

-2۔ " نصیباً مفروضاً " سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ حصے قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں اور اس میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی، تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں اس لئے جو بھی حکم ہے اب اس پر قیامت تک عمل ہوگا اور ان میں کوئی بھی کمی بیشی نہیں کر سکتا کیونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہے نیز اس میں ترجیح استحقاق ہے ضرورت نہیں۔ پس مالدار وارث کو اس کے حصے سے محروم کرکے غریب غیر مستحق شخص کو اس میت کا وارث بنانا نیکی نہیں بلکہ گناہ ہے۔ کیونکہ یہ "نصیباً مفروضاً" کے مقابلے کی صورت ہے بشرطیکہ اس کو غلط اور گناہ سمجھا جائے اور اگر غلط کی بجائے کوئی صحیح سمجھ کر کرے گا تو یہ کفر ہے۔ اعاذنا اللہ منہ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم یعنی "نصیباً مفروضاً" پر ناپسندیدگی کا اظہار ہے اور اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت کے ذریعے جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا اور نہ ہی قبضہ کرنا شرط ہے، نہ اس کا راضی ہونا ضروری ہے بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے مال کا مالک ہو چکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کردے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کردے۔ نیز کوئی وارث اپنے مورث کا دشمن بھی ہو لیکن اس نے اس کو قتل نہ کیا ہو یا مرتد نہ ہو چکا ہو کیونکہ ان کا استثنا احادیث شریف میں بھی آیا ہے تو بھی اس کو شرعی قاعدہ کے مطابق اس کا حصہ دیا جائے گا۔ ان حصوں کی حفاظت کا انتظام یہاں تک ہے کہ اگر کوئی اپنے وارثوں کو محروم کرنے کے لئے کوئی وصیت کرے چاہے وہ نافذ ہو سکے یا نہیں اس مورث کے جہنم میں پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے چاہے وہ ایمان دار اور صالح ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ﴿بعض مرد اور عورتیں ساٹھ سال (یعنی عمر بھر) اللہ تعالیٰ کی پوری

اطاعت کرتے ہیں پھر موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں وارثوں کو ضرر پہنچاتے ہیں (مثلاً کسی اپنے پسندیدہ وارث کو کسی طریقے سے زیادہ دے جاتے ہیں یا کسی ناپسندیدہ وارث کو محروم کر دیتے ہیں یا کسی غیر وارث کو فقط اپنے ناپسندیدہ ورثاء کو محروم کرنے کے لئے دے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔) اس وجہ سے دوزخ ان کے لئے واجب ہو جاتی ہے۔(10) ﴾

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَعْرُوفاً "

(النساء آیت نمبر8)

اور جب وارثوں میں ترکہ تقسیم ہونے کے وقت (یہ لوگ) موجود ہوں (یعنی دور کے) رشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ (اس توقع سے کہ شاید ہم کو بھی کچھ مل جائے، رشتہ دار تو ممکن ہے کہ گمان استحقاق سے اور دوسرے بہ امید خیر خیرات) تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دے دو اور ان کے ساتھ خوبی (اور نرمی) سے بات کرو (وہ بات رشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ سمجھا دو کہ تمھارا حصہ شرع سے اس میں نہیں ہے، ہم معذور ہیں۔ اور دوسروں سے یہ کہ دے کر احسان نہ جتلاؤ)

فائدہ۔

1۔ ان حصوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کی تاکید کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ضرورت مندوں اور غیر مستحق رشتہ داروں کے ساتھ سختی پر اتر آئے بلکہ قرآن حکیم کا بیان کردہ حکیمانہ طرز اختیار کرے اور وہ یہ کہ:-

ضرورت مندوں اور غیر مستحق رشتہ داروں کے ساتھ نرمی اور خوبی کی بات کرے صرف بالغ ورثاء اپنے حصے سے ضرورت مندوں کو دے کر ان کی دل جوئی کریں لیکن دے کر احسان نہ جتلائیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دیں اور نابالغ ورثاء کے مال میں کوئی تصرف صدقہ خیرات کا ناجائز ہے کیونکہ وہ خود ناسمجھ ہیں اور دوسروں کو ان کے مال میں اس طرح کے تصرف کا حق نہیں۔ مورث کے ان رشتہ داروں کو جو غیر مستحق ہیں یہ بات نرمی سے سمجھائی جائے کہ اس کے مال میں شریعت کی طرف سے آپ کا حصہ مقرر نہیں اس لئے محسوس نہ فرمائیں۔ بعض حضرات نے شاید نیک نیتی سے لیکن انتہائی جرأت سے اس آیت سے یہ استدلال

کیا ہے اور یتیم پوتے پوتی وغیرہ کو جو بیٹوں کی موجودگی کے سبب سے محجوب ہوں اور ان کے حق میں دادا مرنے سے پہلے وصیت نہ کر پایا ہو ان کے لئے وصیت واجبہ کا قانون تجویز کیا ہے۔اس کے مطابق سٹیٹ کو میت کی جانب سے وصی قرار دیتے ہیں جو میت کے ترکہ میں ان پوتوں پوتیوں کو ایک ثلث میں حصّہ دلواتے ہیں۔یہ تجویز چاہے جتنی بھی نیک نیتی پر مبنی ہو شریعت کے اندر در اندازی ہے اور بقول سابق جسٹس پیر کرم شاہ مرحوم یہ یورپ کی نقالی کی طرف ایک قدم ہے کیونکہ وہاں سب کچھ وصیت پر ہے۔جب کہ ہمارے ہاں اب سب کچھ میراث کے قواعد پر ہے۔یہ بحث چونکہ کافی لمبی ہے لھٰذا اس کے لئے ایک علیحدہ باب مختص کیا گیا ہے جس میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

"وَالْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْتَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِم ذُرِّيَّةً ضِعَافاً خَافُوا عَلَيهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلاً سَدِيدًا"

(النساء آیت نمبر9)

اور (یتامٰی کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر اپنے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ (کر مر) جاویں تو ان (بچوں) کی ان (لوگوں) کو فکر ہو (کہ دیکھئے ان کو کوئی آزار نہ دے، تو ایسا ہی دوسرے بچوں کے لئے بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ہم ان کو آزار نہ دیں) سو (اس بات کو سوچ کر) ان لوگوں کو چاہیے کہ (یتامیٰ کے معاملے میں) خدا تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں (یعنی فعلاً آزار و ضرر نہ پہنچائیں) اور (قولاً بھی ان سے) موقع کی بات کہیں (اس میں تسلی اور دل جوئی کی بات بھی آگئی، اور تعلیم و تادیب کی بات بھی آگئی، غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اصلاح کریں)

"اِنَّ الَّذينَ يَأكُلونَ أمْوالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إنَّمَا يَأكُلونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْراً"

(النساء آیت نمبر10)

بلا شبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا اسحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں (دوزخ کی) آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی انجام اس کھانے کا یہ ہونے والا ہے اور (اس انجام کے مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں، کیونکہ) عنقریب (ہی دوزخ کی) جلتی (آگ) میں داخل ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)

فائدہ۔

جیسا کہ ہم سب لوگ اس فکر میں ہوتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے بچے آرام سے رہیں اور اس کے لئے دوسروں کی ذمہ داری بھی لگاتے ہیں ایسے ہی دوسروں کے بچوں کے بارے میں بھی فکر ہونی چاہیے جو یتیم ہوگئے ہیں جن کا اب خیال رکھنے والا اس دنیا میں کوئی نہ رہا لیکن کیا ہوا اللہ تعالیٰ تو موجود ہے جو سب پر ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے اس لئے اس احکم الحاکمین ذات نے تاقیامت حکم جاری فرمایا ہے کہ جو ان کا مال ہڑپ کرے گا وہ ایسا ہے جیسا کہ پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔یعنی آخری انجام ان کا جہنم ہے ان یتیموں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان کی جان اور مال کی اصلاح کیا کریں اور ان سے جس موقع پر جو بات مفید ہو وہی کہنی چاہیے جس میں حکمت کے ساتھ ان کی تربیت بھی آ گئی۔اگر کوئی آدمی اس یتیم کے لئے جس کا والد اس کے دادا کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے اور اس کے چچا موجود ہوں استدلال کر رہا ہو تو وہ غلط ہے۔کیونکہ وہ یتیم شرعاً مال کا مالک ہی نہیں ہے۔اس لئے وہ یتیم ضرورت مند تو ہو سکتا ہے لیکن وہ دادا کے مال کا مستحق نہیں ہو سکتا۔اس کے بارے میں کسی کو اگر تفصیل سے دیکھنا ہو تو وہ اس کتاب کے آخر میں دیا گیا مقالہ ” محروم پوتے کی میراث“ دیکھ سکتے ہیں۔

یُوصِیکُمُ اللّٰهُ فِی أَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَیَیْنِ فَإِنْ کُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَإِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ إِنْ کَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَمْ یَکُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ کَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُوصِی بِهَا أَوْ دَیْنٍ آبَاؤُکُمْ وَأَبْنَاؤُکُمْ لَا تَدْرُونَ أَیُّهُمْ أَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا فَرِیضَةً مِنَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیمًا حَکِیمًا ” (النساء آیت نمبر11)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمھاری اولاد کے (میراث پانے) کے باب میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر (یعنی ایک لڑکا لڑکی ایک ایک یا کئی کئی ملی جلی ہوں تو ان کے حصوں میں باہم یہ نسبت ہو گی کہ ہر لڑکے کو دوہرا اور ہر لڑکی کو (اکہرا) اور اگر (اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں، (گو) دو (یا دو) سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا۔اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے (اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے۔کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کہ جگہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کا حصہ باوجود یہ کہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے نہ گھٹتا۔پس جب دوسری بھی لڑکی ہو، تب تو تہائی سے کسی طرح نہیں گھٹ سکتا اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں۔پس اس کا بھی ایک تہائی ہو گا۔دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین

لڑکیوں میں شبہ تھا کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی کل مل جاوے، اس لئے فرمایا کہ گو لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں مگر دو تہائی سے نہ بڑھے گا) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو (کل ترکہ کا) نصف ملے گا۔ (اور پہلی صورت میں ایک ثلث بچا ہوا، اور دوسری صورت کا ایک نصف بچا ہوا، اور دوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے، یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر انہی کو دے دیا جائے گا۔ جیسا کہ کتب فرائض میں مذکور ہے) اور ماں باپ (کو میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت میں تو ان) کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ (مقرر) ہے، اگر میت کی کچھ اولاد ہو (خواہ مذکر یا مؤنث، خواہ ایک یا زیادہ اور بقیہ میراث اولاد اور دوسرے خاص خاص ورثاء کو ملے گی۔ اور پھر بھی بچ جائے تو سب کو دی جاوے گی) اور اگر اس میت کی کچھ اولاد نہ ہو اور صرف اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں (یہ دوسری صورت ہے، اور "صرف" اس لئے کہا کہ بھائی بہن بھی نہ ہو، جیسا آگے آتا ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور دو تہائی باپ کا، اور چونکہ صورت مفروضہ میں یہ ظاہر تھا، اس لئے تصریح کی حاجت نہیں ہوئی) اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بہن بھائی (کسی قسم کے) ہوں خواہ حقیقی بہن بھائی ہوں، خواہ صرف باپ شریک ہوں یا صرف ماں شریک ہوں غرضیکہ کسی طرح کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور یہ تیسری صورت ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کو (ترکہ) کا چھٹا حصہ ملے گا۔ (اور باقی باپ کو ملے گا۔ یہ سب حصے) وصیت (کی قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا قرض (اگر ہو تو اس کو بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے) تمھارے اصول و فروع جو ہیں تم ان کی متعلق پورے طور پر نہیں جان سکتے کہ ان میں کون سا شخص تم کو (دنیوی یا اخروی) نفع پہنچانے میں (باعتبار توقع کے) نزدیک تر ہے۔ (یعنی اگر تمھاری رائے پر یہ قصہ رکھا جاتا تو بغالب احوال تم لوگ تقسیم میں مدار ترجیح و تفضیل کا اس شخص کی نفع رسانی پر رکھتے، اور اس مدار کے یقینی ہونے کا خود کوئی طریقہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ تو اس کا مدار تجویز ٹھہرانا ہی صحیح نہ تھا پس جب نفع میں مدار بننے کی قابلیت نہ تھی اس لئے دوسرے مصالح اور اسرار کو گو وہ تمھارے ذہن میں نہ آئیں اس حکم کا مبنیٰ ٹھہرا کر) یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا (اور یہ امر) بالیقین (مسلم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں (پس جو حکمتیں انھوں نے اپنے علم سے اس میں مرعی رکھی ہیں وہی قابل اعتبار ہیں، اس لئے تمھاری رائے پر نہیں رکھا)۔

فائدہ

اس سے درج ذیل میراث کی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

## اولاد کے بارے میں حکم۔

اگر اولاد میں مرد اور عورتیں اکٹھی ہوں تو ان میں للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ جاری ہو گا یعنی ہر مرد کو ہر عورت سے دگنا ملے گا۔ یہ عصبات کے لئے پہلا قانون ہے۔ پس نرینہ اولاد موجود ہو تو برابر کی زنانہ اولاد اس کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی اور ان سے دور کی نرینہ اولاد محروم ہو جائے گی۔

اس آیت شریفہ میں یہ ارشاد ہے کہ۔

1۔ بیٹے بیٹیاں دونوں موجود ہوں تو ان میں جتنا ترکہ دوسرے ذوی الفروض (یعنی جن لوگوں کا حصّہ پہلے سے طے ہے) سے بچا ہو وہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ " کے قاعدے سے تقسیم کیا جائے گا۔

2۔ اگر صرف عورتیں ہوں تو ان میں دو صورتیں بن سکتی ہیں۔

الف۔ صرف ایک عورت ہو تو اس کو کل ترکہ کا نصف ملے گا۔

ب۔ اگر ایک سے زیادہ عورتیں ہوں تو سب کو مشترکہ طور پر کل ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔

حضرت تھانوی نے جو عقلی دلیل اس آیت کی مختصر تفسیر میں دی ہے وہ اپنی جگہ بہت قوی ہے لیکن فیصلہ صرف اس دلیل پر نہیں ہے بلکہ اس کی نقلی دلیل بھی موجود ہے جیسا ابوداؤد شریف کی باب الفرائض میں دی ہوئی حدیث شریف میں آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ باہر نکلے۔ اتنے میں ہمارا گزر اسواق میں ایک انصاری عورت پر ہوا۔ وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ یہ دونوں لڑکیاں ثابتؓ بن قیس ( میرے شوہر) کی ہیں جو آپ کے ساتھ غزوہ احد میں شہید ہوگئے ہیں۔ ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے، اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا۔ اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم اگر لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو گا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرمادے گا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اور سورۃ نساء کی یہ آیت " يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ

مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْن " نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر قبضہ کیا ہوا تھا) بلاؤ، آپ نے اس کو فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے تم خود رکھ لو۔

ابو داؤد نے اس روایت کی تصحیح کی کہ یہ عورت سعدؓ بن ربیع کی زوجہ تھی جو یمامہ میں شہید ہوئے تھے (12)۔

بیٹے کا حصّہ:

3۔ آیت میں بیٹے کے حصے سے سکوت یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو باقی ہے سب اس کا ہے کیونکہ آیت شریفہ میں بیٹے کی فضیلت بیٹی پر تو ظاہر ہے۔ پس بیٹی کا حصہ اگر ایک ہو تو نصف ہے یعنی نصف سے کم بیٹی کا حصہ کوئی نہیں اس لئے اگر بیٹا ہو اس کا حصہ بیٹی سے دگنا یعنی کل ہونا چاہیے اور جب ایک کے لئے یہ صورت ہے تو ایک سے زیادہ بیٹیوں کے لئے باقی کل تو بدرجہ اولیٰ ہو گا۔ اس کا اندازہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْن " سے بھی لگانا مشکل نہیں۔ اور وہ یہ کہ مرد اور عورتیں اگر ملی جلی ہوں تو ان کو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْن " ملتا ہے یعنی 1 : 2 پس اگر صرف مرد ہی ہوں تو ان کو 2 : 2 سے ملنا چاہیئے یعنی برابر برابر تو اگر ایک ہو تو اس کو سارا ملے گا اور کئی ایک ہوں تو سب کو برابر برابر ملے گا یعنی باقی ترکہ سب پر برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اس میں البتہ ایک بات کا خیال رکھنا پڑے گا اور وہ یہ کہ بیٹی کو اکیلی ہونے کی صورت میں کل مال کا نصف دیا جا رہا ہے جبکہ بیٹے کو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو باقی بچتا ہے وہ سارے کا سارا دیا جائے گا جیسا کہ بخاری و مسلم شریف کی حضرت ابن عباسؓ سے مروی اس حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصہ دینے کے بعد جو باقی رہ جائے وہ اس کے پہلے مستحق مرد (عصبہ) کو دو (13) اور اجماع سے ثابت ہے کہ سب سے قریبی مرد رشتہ دار بیٹا ہے۔ پھر پوتا پھر پڑپوتا پھر سکڑپوتا ہے۔ یعنی نرینہ اولاد جو اقرب ہو اس کو باقی سب کچھ ملے گا۔ نرینہ اولاد نہ ہو تو پھر دوسرے عصبات کی باری ہے۔

4۔ جن کا حصہ مقرر تو نہ ہو لیکن بعد میں جو ذوی الفروض سے باقی بچے سب کچھ ان میں سے جو پہلے ملے اس کو ملنا ہو ان کو عصبات کہتے ہیں ان کا اس آیت سے استحقاق ثابت ہوا۔ چونکہ عصبات کے بارے میں ایک علیحدہ باب دیا جا رہا ہے اس لئے اس کی باقی تفصیل وہیں سے ملاحظہ فرمائی جائے۔ اس ترتیب سے کوئی یہ

اندازہ نہ لگائے کہ صرف بیٹیاں ہی ہوں تو ان میں بھی باقی ترکہ برابر تقسیم کیا جائے کیونکہ ان کا استثنائی قانون پہلے بیان ہو چکا کہ وہ اس صورت میں ذوی الفروض بنتی ہیں اور ان کا حصہ کتاب اللہ میں مقرر ہے جو کہ ایک کے لئے کل مال کا نصف اور ایک سے زیادہ کے لئے دو تہائی۔ آج کل کے بعض ابنائے زمانہ اس واضح بات میں بھی ابہام ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔ راقم نے ان کی جدل سے بچنے کے لئے ایک مقالہ " میراث میں فتنہ اشراق " کے نام سے لکھا ہے اس کو افادہ عام کے لئے اس کتاب کے آخر میں شامل کیا جارہا ہے۔ اس کا مطالعہ مفید ہو گا ان شاء اللہ۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں تفسیر قرطبی نے میراث سے متعلق کچھ مزید تشریحات بھی کی ہیں جس کا لب لباب یہ ہے کہ یوصیکم اللہ فی اولادکم عام نہیں ہے بلکہ اس کی تخصیص احادیث شریفہ کے ذریعے کی گئی ہے جس کا جاننا ضروری ہے مثلاً وہ اولاد کسی وجہ سے میراث سے محروم نہ ہو مثلاً وہ کافر اور غلام نہ ہو وغیرہ اس کی تفصیل اس کتاب کے باب " میراث سے موانع " میں دیکھئیے۔ اس طرح اس اولاد کو حالت حمل میں بھی حصہ مل سکتا ہے جس کے لئے اس کتاب میں " حمل کا حصہ " مطالعہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح اولاد کی جو مختلف حشیتیں بنتی ہیں ان کا الگ الگ حکم اس کتاب میں متعلقہ حصے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

ماں باپ کا حصہ۔

1۔ اگر میت کی اولاد ہو تو ماں باپ کو ایک ایک سدس دیا جائے گا۔

2۔ اگر میت لاولد ہو تو اگر اس کے وارث صرف ماں باپ ہوں تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث دیے جائیں گے لیکن اگر میت کے کوئی سے ایک سے زیادہ بہن بھائی موجود ہوں تو ماں کا حصہ پھر سدس ہو جائے گا پس یہ ثابت ہوا کہ اولاد موجود ہو یا ایک سے زیادہ بہن بھائی ہوں تو ماں کا حصہ ایک سدس ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ صرف ایک بہن یا ایک بھائی کی موجودگی سے ماں کا حصّہ متاثر نہیں ہوتا۔

بعض ناسمجھ کسی وقتی عارضہ کی وجہ سے جب میراث کے حصوں کی تقسیم کو اپنے حالات پر منطبق نہیں پاتے تو اس پر تعجب کرتے ہیں مثلاً میت کا باپ موجود ہو تو اگرچہ ایک سے زیادہ بہن بھائی حصہ تو نہیں پاتے لیکن ماں کے حصے کو ثلث سے کر دیتے ہیں اس کی وجہ کیا ہوگی تو ایسے ہی سوالات اور اشکالات کی جواب کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ﴿ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاءُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا

حَکِیماً " یعنی ہمیں مکمل حالات کا پتہ نہیں چل سکتا کہ کون ہمارے لئے نفع کے لحاظ سے قریب ہے۔ چونکہ یہ حصے اللہ میاں نے مقرر کیے ہیں جس کی کمال حکمت اور کمال علم میں کسی مومن کو شک نہیں ہو سکتا اس لئے خوشی سے اس تقسیم پر راضی ہونا چاہیے سمجھ میں آئے یا نہیں۔ اگر میراث کی تقسیم کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑا جاتا تو ضرور اپنی کم علمی اور کم فہمی کی بنیاد پر ٹھوکر کھاتے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس امتحان سے محفوظ کر دیا ہے تو حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو دل سے تقسیم کرنا چاہیے تاکہ دونوں کی سرخروئی حاصل ہو جائے ورنہ چوں چرا اس سے حاصل تو کچھ ہو گا نہیں مفت میں اپنی عاقبت خراب کر دیں گے۔

## ترکہ کا مفہوم

اس آیت شریفہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ورثاء کو اس وقت یہ مقرر حصے دیے جائیں گے جب میت کے مال سے اس پر جتنا قرض ہے وہ نکال لیا گیا ہو اور اگر اس نے وصیت کی ہو تو اس وصیت کے بقدر مال بھی اس سے نکال لیا گیا ہو۔ یہاں تو اتنا ذکر کیا گیا ہے لیکن وصیت کے بارے میں تین باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے
۔

1۔ وصیت وارث کے لئے جائز نہیں جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ

" حضور اقدس ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا پس کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت معتبر نہیں۔(14)

2۔ وصیت ایک ثلث سے زیادہ میں معتبر نہیں۔ اگر کسی نے ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت کی تو وہ ایک ثلث کی حد تک پوری کی جائے گی۔ اور اس ثلث میں ہر موصیٰ لہم کے لئے جتنی وصیت کی گئی ہے ان کے آپس میں تناسب کا خیال رکھا جائے گا۔ جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث

شریف ارشاد نبوی ﷺ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن وقاص کا بیان ہے کہ میں فتح مکہ میں ایسا بیمار ہوا کہ موت کے کنارے سے جالگا۔ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے پاس بہت مال ہے اور سوائے ایک لڑکی کے اور کوئی (ذوی الفروض میں سے) وارث نہیں کیا میں اپنے کل مال کے متعلق وصیت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا تو دو تہائی مال کی، فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا آدھے مال کی، فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا تو کیا ایک تہائی مال کی، فرمایا

تہائی (کی وصیت کر سکتے ہو) اور تہائی بھی بہت ہے۔ اگر تم اولاد کو مالدار چھوڑ جاؤ تو اس سے بہتر ہے کہ ان کو فقیر چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے ہاتھ تکتے پھریں۔ تم جو خرچ بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کروگے تو اس کا ثواب تم کو ضرور ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دوگے (اس کا ثواب بھی ملے گا) ۔(15)

ترمذی شریف کے الفاظ کچھ مختلف ہیں اس روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک جزو کی وصیت کر سکتے ہو۔ میں حضور ﷺ سے برابر کم ترکہ کے چھوڑنے کی درخواست کرتا رہا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ترکہ کے تیسرے حصے کے متعلق وصیت کر سکتے ہو اور تہائی بھی بہت ہے۔ علماء کرام کا اجماع ہے کہ قرض کا ادا کرنا وصیت کے نفاذ سے مقدم ہے۔ یہاں تک کہ تمام مال میت کے قرضے میں لگ جائے تو نہ وصیت نافذ ہوگی اور نہ میراث چلے گی لیکن اس رکوع میں تینوں جگہ جہاں جہاں وصیت کا ذکر آیا وہاں وصیت کا ذکر قرض کی ادائیگی سے پہلے کیا گیا ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا حق قرض سے مقدم ہے۔ حضرت علیؓ نے اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہوئے فرمایا کہ کہ تم قرآن میں اس آیت من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین پڑھتے ہو (جس سے بظاہر وصیت کا دین سے مقدم ہونا معلوم ہوتا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وصیت سے پہلے قرض کی ادائگی کا حکم دیا ہے (17)" تاہم یہ نکتہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اگر عملاً وصیت مؤخر ہے تو لفظاً اس کو دین (قرض) سے پہلے کیوں بیان کیا گیا ہے۔ صاحب روح المعانی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: " یعنی آیت میں دین پر وصیت کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ میراث کی طرح بغیر کسی عوض کے ملتی ہے اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں۔ اس لئے وارثین کی جانب سے اس کو نافذ کرنے میں کوتاہی ہونے یا دیر ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، اپنے مورث کا مال کسی کے پاس جاتا ہوا دیکھ کر اس کو ناگوار ہو سکتا تھا اس لئے شان وصیت کا اہتمام فرماتے ہوئے دین پر اس کو مقدم کیا گیا۔ پھر بھی بات یہ ہے کہ قرض کا ہر میت پر ہونا ضروری نہیں۔ اگر زندگی میں رہا تو موت تک اس کا باقی رہنا بھی ضروری نہیں۔ اور اگر موت کے وقت موجود بھی ہو تب اس کا مطالبہ حق دار کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے ورثاء بھی انکار نہیں کر سکتے اس وجہ سے اس میں کوتاہی کا احتمال بہت کم ہے بخلاف وصیت کے جب مرنے والا مال چھوڑتا ہے تو اس

ہو تا صرف میت کی خواہش ہوتی ہے جو اپنی موت کے بعد کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ورثاء کی طرف سے کوتاہی کا زبردست اندیشہ ہے اور آج کل کے حالات تو اس پر شاہد عدل ہیں اس لئے وصیت کو دین پر الفاظ میں مقدم کیا گیا۔

3۔ ناجائز وصیت کو پورا نہیں کیا جائے گا کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا امر ہے ولا تعاونوا بالاثم العدوان اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ " لاطاعۃ لمخلوق فی المعصیۃ الخالق عزوجل" (18)

وصیت کے بارے میں زیادہ تفصیل جاننے کے لئے اعلاء السنن (باب الوصایا جلد نمبر 18 ) کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ وصیت کا اجراء تب ہو گا جب ترکہ سے میت کے ذمے جو واجب الادا قرضہ ہے ادا کر دیا جائے۔ قرضہ سے بھی مقدم میت کی بطریقہ اوسط ضروری شرعی (رواجی نہیں) تجہیز و تکفین ہے۔ احناف، شوافع اور مالکیہ کے نزدیک جو قرض متعلق بعین ہو اس کی ادائیگی سب سے مقدم ہے جیسے زید نے اگر گھوڑا خریدا لیکن ثمن (قیمت) مؤجل تھی اور ادائیگی سے پہلے ہی مر گیا تو اگر گھوڑا موجود ہے تو بائع گھوڑا تجہیز و تکفین سے پہلے کھول کر لے جائے گا ورنہ اس کی قیمت کی ادائیگی اس کو کی جائے گی۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ یہ ترکہ ہی نہیں یہ تو میت کے ساتھ اور کا مال تھا جو اس نے ترکہ سے پہلے وصول کر لیا اس لئے یہ ان کے نزدیک تجہیز و تکفین پر بھی مقدم ہے۔ باقی قرضوں کی ادائیگی البتہ تجہیز و تکفین کے بعد کی جائے گی۔ عورت کی تجہیز و تکفین کے بارے میں آئمہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ خاوند پر اس کی بیوی کے کفن دفن کے اخراجات کے قائل نہیں اور اس کی ادائیگی اس کے ترکہ سے کی جائے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ وہ زوج کے لئے اجنبی بن گئی اور چونکہ نفقہ اور لباس وغیرہ کا تعلق استمتاع کے ساتھ ہے جو اب نہیں رہی اس لئے اگر اس نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تو اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ اس سے لیا جائے گا جس پر اگر اس کی شادی نہ ہوتی تو وہ اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوتے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اگر وہ مسلمان ہے تو بیت المال ادا کرے گا۔

امام ابو حنیفہؒ البتہ اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ اس کے زوج پر ڈالتے ہیں چاہے وہ مالدار ہو یا غریب اور امام شافعیؒ تو مالدار ہونے کی صورت میں زوج کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن اگر وہ غریب ہے تو اس پر اس کو لازم نہیں ٹھہراتے کیونکہ ان کے نزدیک علاقہ زوجیت باقی ہے کیونکہ اس سے میراث پاتا ہے وغیرہ۔

احناف کے نزدیک قرض تین قسموں پر ہے۔ پہلا قرض وہ امانت ہے جس کا اقرار میت نے مرض الموت سے پہلے کیا ہو یا مرض الموت میں کیا لیکن اس پر گواہ ہو یا لوگوں کے مشاہدہ سے ثابت ہو۔ اس کے بعد وہ قرض جس کا اقرار مرض الموت میں میت نے کیا ہو لیکن نہ تو اس گواہ قائم کیے ہوں اور نہ ہی لوگوں کے مشاہدہ سے ثابت ہو۔ تیسری قسم کا قرض خدا کا قرض ہے جیسے زکوٰۃ و قربانی وغیرہ۔

اس میں احناف کے نزدیک سب سے پہلے پہلی قسم کے قرض کی ادائیگی ہوگی چاہے اس میں سارا مال ختم ہو جائے پھر دوسری قسم کے اور پھر تیسری قسم کے بارے میں اگر میت نے وصیت کی ہو تو اس کو ثلث ترکہ میں پورا کیا جائے گا ورنہ وارثوں پر اس کا پورا کرنا واجب نہیں۔

حنابلہ کے نزدیک ہر قسم کے قرض کی ادائیگی میت کے ترکہ سے دیون (قرضوں) کے تناسب سے کی جائے گی۔ شوافع کے نزدیک اللہ کا قرض انسان کے قرض پر مقدم ہے جیسا کہ حدیث شریف ہے کہ "سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ وفا کا حقدار ہے(19)

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ" (النساء آیت نمبر12حصہ اول)

یہاں تک ان مستحقین میراث کے حصص کا بیان تھا جن کا میت کے ساتھ نسب اور ولادت کا رشتہ تھا، مذکورہ آیت میں بعض دوسرے مستحقین میراث کا ذکر ہے اور میت سے ان کا رشتہ نسب کا نہیں بلکہ ازدواج کا ہے۔ علم الفرائض کی کتابوں میں ان کو ذوی الفروض سببی کہتے ہیں۔ جس کا بیان یہ ہے:

" اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمھاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ واحد نہ کثیر) اور اگر ان بیویوں کی کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو (اس صورت میں)

تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا لیکن ہر صورت میں یہ میراث وصیت ( کے قدر مال ) نکالنے کے بعد کہ اس کی وصیت کر جائیں یا دین ( اگر ہو تو اس کی

ادائیگی ) کے بعد ( ملے گی ) اور بیویوں کو چوتھائی ملے گا۔ اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ ( خواہ وہ ایک ہو یا کئی ہوں کہ چوتھائی سب میں برابر بٹ جائے گا ) اگر تمھاری کچھ اولاد نہ ہو ( نہ مذکر نہ مؤنث نہ واحد نہ کثیر ) اور اگر تمھاری کچھ اولاد ہو تو اس صورت میں ان کو ( خواہ ایک ہو یا کئی ) تمھارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا ۔( یہ بھی دو صورتیں ہیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے ورثہ کو ملے گا، لیکن یہ میراث ) وصیت ( کی قدر مال ) نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین ( اگر ہو تو اس کی ادائیگی ) کے بعد ( ملے گی ) ۔

فائدہ۔

اس سے میراث کے مندرجہ ذیل احکام سامنے آتے ہیں۔

1۔ میاں / بیوی کا حصہ۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ ان کو ذوی الفروض سببی بھی کہتے ہیں۔

اگر میت مرد ہے اور اس کی اولاد موجود ہے یا اس کی موت کے بعد اس کی اولاد موجود رہی تو اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا اور اگر وہ لاولد مرا ہے تو اس کی بیوی کو ایک چوتھائی ملے گا۔ اگر میت عورت ہے اور اس کی اولاد موجود ہے یا اس کی موت کے بعد اس کی اولاد موجود رہی ہے تو اس کے خاوند کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا اور اگر وہ لاولد مری ہے اس کے خاوند کو آدھا ترکہ ملے گا۔

2۔ ماں کا حصہ۔

ماں کا حصہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے لیکن یہاں اس کی تکمیل کی جاتی ہے کیونکہ احادیث شریفہ میں اس کی مزید تفصیل بھی ہے۔ لیکن پہلے اس کو اس لئے نہیں بیان کیا گیا کہ اس کو سمجھنے کے لئے میاں / بیوی کے حصے کا سمجھنا ضروری تھا جو اس وقت تک بیان نہیں کیا گیا تھا۔

پہلی حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ:

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ ہم جس راستے پر عمرؓ کو چلتے ہوئے پاتے تو اس کو آسان پاتے اور انہوں نے فرمایا ہے کہ جب ماں باپ اور خاوند جمع ہو جائیں تو خاوند کے لئے کل مال کا نصف اور ماں

کے لئے ثلث الباقی ہو گا۔(20) ﴾ اور ﴿ حضرت زیدؓ بن ثابت نے خاوند اور ماں باپ کے جمع ہونے کی صورت میں خاوند کو نصف دیا اور ماں کو ثلث الباقی (21)﴾

اسطرح ﴿ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ بیوی اور ماں باپ جب جمع ہو جائیں تو بیوی کے لئے چوتھائی ہو گا اور ماں کے لئے ثلث الباقی (22) ۔﴾ اور ﴿ حضرت بن زید بن ثابتؓ نے بیوی، اور ماں باپ کے جمع ہونے کی صورت میں مسئلہ 4 سے بنایا(23)۔﴾

احادیث شریفہ نمبر 20 اور 21 سے پتہ چلا کہ اگر "عورت میت" کا خاوند اور ماں باپ دونوں موجود ہوں تو اس صورت میں بھی ماں کا حصہ ایک سدس ہو جائے گا کیونکہ قرآن حکیم کے مطابق نصف تو خاوند نے لے لیا اور باقی نصف کا ثلث جو کہ ایک سدس بنتا ہے وہ ماں کو ملے گا۔ جبکہ احادیث شریفہ نمبر 22 اور 23 سے معلوم ہوا کہ اگر " مرد میت" کی بیوی اور ماں باپ موجود ہیں تو ماں کا حصہ ایک ربع (ایک چوتھائی) ہو جاتا ہے۔ ان احادیث شریفہ کا لب لباب یہ ہوا کہ میت اگر لاولد مری ہے اور اس کے ایک سے زیادہ بہن بھائی بھی نہیں (کیونکہ ان میں سے کسی بھی ایک صورت میں ماں کے حصے کا ایک سدس ہونا مندرجہ بالا قانون سے ثابت ہے) تو میاں / بیوی اگر موجود ہو تو اس کو اپنا حصہ دینے کے بعد جتنا ترکہ باقی بچتا ہے اس کا ثلث دیا جائے گا ایسی حالت میں:

الف۔ اگر میت کا خاوند اور باپ بیک وقت موجود ہوں تو ماں کا حصہ ایک سدس ہو جاتا ہے اور

ب۔ میت کی بیوی اور باپ دونوں موجود ہوں تو ماں کا حصہ ربع ہو گا۔

ج۔ اگر میت کی اولاد نہ ہو، نہ ہی اس کے ایک سے زیادہ بہن بھائی ہوں، نہ ہی اس کا خاوند اور باپ بیک وقت موجود ہوں اور نہ ہی بیوی اور باپ بیک وقت موجود ہونے کی صورت ہو تو پھر ماں کا حصہ ثلث ہو گا۔ کیونکہ اولاد اور ایک سے زیادہ بہن بھائی کی غیر موجودگی میں تو نص (قرآن) کے مطابق ماں کا حصہ ثلث ہی ہے۔ اور اس صورت کے حصے پر اثر انداز ہونے والے (بیک وقت) ذوی الفروض سببی اور باپ بھی موجود نہیں۔

حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ نے گو کہ ماں کو ثلث الکل دینے پر اصرار فرمایا لیکن باقی صحابہؓ کا اجماع مندرجہ بالا فیصلے پر ہو گیا۔ اس لئے امت کا اجماع اس پر ہی ہے۔ ﴿ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے حضرت زیدؓ

بن ثابت کے پاس پیغام بھیجا کہ کیا آپ کتاب اللہ میں ماں کے لئے ثلث الباقی پاتے ہیں ؟ تو حضرت زیدؓ بن ثابت نے جواب دیا کہ آپ بھی اپنی رائے سے بات کرتے ہیں اور میں بھی رائے سے بات کرتا ہوں۔(25)﴾

اصل مسئلہ اس میں یہ تھا کہ خاوند اور ماں باپ میں ماں کو ثلث الکل دیا جائے گا تو باپ کو سدس ملے گا کیونکہ نصف تو خاوند نے لیا۔ باقی نصف میں ماں کو ثلث دیا جائے گا تو باپ کے لئے سدس بچے گا۔ چونکہ باپ کی فوقیت ماں پر مسلم ہے اس لئے صحابہ ماں کو ثلث الکل دینے پر تیار نہ ہوئے جیسا کہ عبد اللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ ﴿اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم نہیں دیا کہ ماں کو باپ پر افضل کرکے دکھائیں (24)

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَى بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ"

(النساء 12 آیت نمبر حصہ آخر)

( نسب اور ازدواج سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں ان کے مختصر حقوق بیان کرنے کے بعد اب ایسی میت کے ترکہ کا حکم بیان کیا جارہا ہے جس نے اصول اور فروع نہ چھوڑے ہوں)

اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی، خواہ مرد ہو یا عورت، ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں ( یعنی باپ دادا) اور نہ فروع ہوں (یعنی اولاد اور بیٹے کی اولاد) اور اس (میت) کے ایک بھائی یا ایک بہن (اخیافی) ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے) زیادہ ہوں مثلاً دو ہوں یا اس سے زیادہ) تو وہ سب تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے۔( اور ان میں مذکر اور مؤنث کا برابر حصہ ہے۔ اور بقیہ میراث دوسرے ورثاء کو ملے گی۔ اور اگر کوئی اور نہ ہو تو پھر انہی پر لوٹا دی جائے گی۔ یہ دو صورتیں ہوئیں، اور ان دونوں صورتوں میں یہ میراث) وصیت ( کے قدر مال) نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا (اگر) قرض ( ہو تو اس کو بھی نکالنے) کے بعد ملے گی بشر طیکہ وصیت کرنے والا کسی ( وارث) کو ضرر نہ پہنچاوے( نہ ظاہراً نہ ارادہ یہ کہ رہے ثلث کے اندر، لیکن نیت یہ ہو کہ وارث کو کم ملے، یہ ظاہراً نافذ ہو جائے گی۔ لیکن گناہ ہو گا۔) یہ (جس قدر یہاں تک مذکور ہوا) حکم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔( کہ کون مانتا ہے کون نہیں مانتا اور نہ ماننے والوں کو وہ فوراً سزا نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ) حلیم ( بھی) ہے۔

فائدہ۔

اگر کوئی شخص عورت ہو یا مرد ایسا مرے کہ اس کے بعد نہ تو اس کے اصول میں کوئی زندہ رہا ہو اور نہ فروع میں تو اگر اس کے کوئی ایک بھائی یا بہن زندہ ہو تو اس کو اس کے مال کا چھٹا حصہ دیا جائے گا اور اگر ایک سے زیادہ اخیافی بہن بھائی زندہ ہوں تو ان سب کو اس کے ایک تہائی مال میں شریک کیا جائے گا۔ اور ان میں مذکر اور مؤنث ہونے کا کوئی فرق نہیں۔ یعنی اس تہائی مال کو ان سب میں برابر تقسیم کیا جائے گا جو مال ان اخیافیوں کو دینے کے بعد رہے گا وہ دوسرے ورثاء میں شرعی قاعدے کے مطابق بانٹا جائے گا۔

2۔ یہ تقسیم اس وقت ہوگی جب اس میت کے مال سے اگر اس پر کوئی قرض ہے اور اس نے کوئی وصیت کی ہے اس کو نکالا جائے پس دوسرے لفظوں میں قابل تقسیم ترکہ وہ ہوتا ہے کہ اس سے واجب الادا قرض اور وصیت جو میت کر چکا ہے اس کا شرعی طریقہ کے مطابق اجراء کیا جائے۔

3۔ وصیت اور دَین کے ساتھ لفظ غیر مضآرٍّ بھی یہ نشاندہی کر رہا ہے کہ وصیت اور ادائیگی قرض میں کہیں کسی وارث کو نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو جائے کہ کوئی ایسا وارث جو اپنے مورث کا پسندیدہ نہ ہو اور اپنا مال اس کے پاس جانے سے روکنے کے لئے جھوٹے قرض کا اقرار کر لے یا کسی غیر وارث کے لئے وصیت کر دے۔ اس پر وعید سورۃ نساء کی آیت نمبر 6 کی تشریح میں گزر چکی ہے۔

4۔ واضح رہے کہ اس آیت میں یہ قید مذکور نہیں کہ جس کا حصہ اس میں بیان کیا جا رہا ہے وہ اخیافی بھائی ہی ہیں لیکن یہ قید بالاجماع معتبر ہے، حضرت سعد بن وقاصؓ کی قرات میں بھی اس آیت میں اس طرح ہے " ولہ اخ اواخت من امہ "

جیسا کہ علامہ قرطبیؒ صاحب روح المعانی اور ابو بکرؒ جصاص نے دیگر حضرات نے نقل کیا ہے گو یہ قرات متواتر نہیں لیکن اجماع امت ہونے کی وجہ سے معمول بِہا ہے۔ اجماع اصول فقہ کا تیسرا اصول ہے پس اگر کسی مسئلہ پر اجماع ثابت ہو جائے تو از روئے حدیث اس میں غلطی کا امکان نہیں رہتا۔ اور اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ سورۃ نساء کے ختم ہونے پر بھی کلالہ کی میراث کا ذکر ہے وہاں مرد اور عورتوں کی جمع کی صورت میں للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے اور وہاں چونکہ ذکر حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کا ہے پس

اگر اس آیت میں بھی ان ہی کا ذکر ہوتا ہو تو ان کے احکام میں تعارض لازمی تھا کیونکہ یہاں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ " کا قاعدہ استعمال کرنے کے لئے نہیں فرمایا جارہا ہے۔

کلالہ کی میراث۔

ان سطور میں کلالہ کی میراث بیان کی گئی ہے جو کہ ایک معرکۃ الآرابحث ہے یہ ان تینوں امور میں سے ہے ایک جن کے بارے میں حضرت عمرؓ کو آخر وقت تک فکر تھی جیسا کہ ابن ماجہ شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ﴿تین امور ہیں جن کے بارے میں اگر حضور ﷺ کا فیصلہ موجود ہوتا تو یہ مجھے دنیاومافیھا سے زیادہ محبوب تھا اور وہ تین امور کلالہ، ربا اور خلافت ہیں۔(26)﴾ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جب کلالۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:﴿میں اپنی رائے سے جواب دیتا ہوں اگر ٹھیک ہوا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس سے بری الذمہ ہیں، کلالہ وہ یہ کہ جس کا نہ لڑکا ہو نہ باپ یعنی ماخلا الولد والوالد (27)﴾۔

کلالہ اکلیل سے مشتق ہے اور اکلیل اس تاج کو کہتے ہیں جو سر کو ہر طرف سے گھیر لے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کے وارث ارد گرد کے حاشیہ کے لوگ ہیں اصل اور فرع یعنی جڑ یا شاخ نہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ کلالہ وہ شخص ہے جس کی نہ اولاد ہو نہ والد۔ یہی حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے مروی ہے جبکہ حضرت سعید بن جبیرؓ سے منقول ہے کہ کلالۃ وہ وارث ہے جو میت کا نہ ولد ہو نہ والد۔ حضرت جابرؓ والی حدیث (28) میں کلالۃ " سے یہی مراد ہے کیونکہ آپؓ نے کہا تھا کہ میرے وارث کلالہ ہیں۔ کلالۃ کے بارے مزید تفصیلات علامہ قرطبیؒ کی تفسیر میں دیکھی جائیں، مشہور تعریف یہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں مذکور ہے یعنی مرنے والے کے اصول اور فروع نہ ہوں۔ ابن کثیر نے تو اس تعریف پر آئمہ اربعہ اور فقہا سبعہ کا اجماع نقل کیا ہے۔ اور صاحب اعلاء السنن نے المسبوط کے حوالے سے لکھا ہے کہ الکلالۃ ماخلا الولد والوالد " پر اکثر صحابہؓ جیسے ابو بکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، زیدؓ، ابن مسعودؓ کا اتفاق ہے اور جمہور علماء کا یہی قول بتایا ہے اور فرمایا کہ یہی قول ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے قول کی تشریح میں صاحب اعلاء السنن نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ اس میں سے کچھ یہاں بھی نقل کیا جاتا ہے۔

" اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دو مقامات پر کلالہ کا ذکر فرمایا ہے (یعنی آیت نمبر 12 اور آیت نمبر 176 میں) ۔اس میں ایک جگہ اخیافی بہن بھائیوں کا حصّہ بیان فرمایا اور دوسری جگہ پر حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کا۔پس اگر باپ بہن بھائیوں کے لئے حاجب نہیں ٹھہرے گا تو باپ بعض صورتوں میں خود محجوب ہو جائے گا اور ایسا ممکن نہیں۔وہ یوں کہ کسی عورت میت کا باپ،خاوند اور علاتی بہن رہ گئے۔اب خاوند نے نصف لیا،علاتی بہن نے بھی نصف لیا تو باپ کے لئے کیا بچا۔کچھ بھی نہیں۔(اگر کوئی کہے کہ عول کریں گے تو وہ ممکن نہیں کیونکہ یہاں باپ صرف عصبہ کے طور پر ہی حصّہ لے سکتا ہے کیونکہ میت کی اولاد نہیں) ۔اس طرح اگر میت کا خاوند،ماں باپ اور چند اخیافی بہن بھائی رہ گئے تو خاوند کو نصف،ماں کو سدس،اور اخیافی بہن بھائیوں کو ثلث۔پس باپ کے لئے پھر کچھ نہیں بچا۔جو کہ ہو نہیں سکتا کیونکہ باپ جب میت کی اولاد کی وجہ سے محروم نہیں ہوتا تو اپنی اولاد کی وجہ سے کیسے محروم ہوگا اور جب میت کی ماں کی وجہ سے محروم نہیں تو اس کی اولاد کی وجہ سے کیسے محروم ہوگا۔پس ماخلا الوالد کا حصّہ تو بے غبار ثابت ہوا۔اب دوسرے حصّے ماخلاالولد کی بات رہ گئی تو جب میت کا والد اخوہ کا حاجب ٹھہرا تو اس میت کا ولد تو بالاولیٰ اس کا حاجب ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تو میت کا زیادہ اقرب ہے کیونکہ ابعد جب حاجب ہو تو اقرب تو لازماً حاجب ٹھہرے گا۔پس کلالۃ کی ما خلا الد والوالد " کی تعریف جو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے منقول ہے ہر طرف سے صحیح ثابت ہوئی۔"

جہاں تک حضرت عمرؓ کا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ اختلاف کا تعلق ہے اس کے بارے میں صاحب اعلاء السنن رقمطراز ہیں کہ اس میں حضرت عمرؓ کی حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حیاء کی وجہ سے مخالفت ترک کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت عمرؓ، حضرت صدیقؓ سے ماخلا الولد و الوالد " میں اختلاف کر رہے تھے کیونکہ آپ کا ایسا اختلاف منقول نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ تو جد کو بھی بہ ایں معنی اس میں شامل فرماتے تھے کہ جد اب کے غیر موجودگی میں اس کا قائمقام ہے جس میں حضرت عمرؓ کی حضرت صدیقؓ کے ساتھ اختلاف مشہور ہے۔پس اگر آپ سے یہ منقول ہے کہ الکلالۃ ماخلا الوالد " تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماخلا الولد نہیں کیونکہ ایسا ہونا بوجوہ ممکن نہیں بلکہ اس سے صرف سکوت ثابت ہوتا ہے۔اور اگر کلالۃ کے لئے ماخلا الولد مروی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ماخلا الوالد کو نہیں مانتے تھے کیونکہ وہ پہلے سے طے

ہے بلکہ اس میں بھی صرف پہلے حصّے سے سکوت ہے۔اور اگر آپ سے اس میں فیصلے سے انکار کی روایت مروی ہے تو وہ صرف اتنا کہ جد اور اب کے درمیان فیصلہ سے قاصر تھے۔

جد اور بہن بھائیوں کا آپس میں شریک ہونا اور نہ ہونا اس میں صحابہؓ میں اختلاف موجود ہے جو اخوہ مع الجد کے بحث سے پہچانا جاتا ہے۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلاَلَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالاً وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ''

(النساء آیت نمبر176)

لوگ آپ سے (میراث کلالہ کے باب میں یعنی جس کی اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت فرماتے ہیں آپ (جواب میں) فرمادیجئیے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کی باب میں حکم دیتا ہے (وہ یہ کہ) اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث اور نہ باپ ہو) اور اس کی ایک (عینی یا علاتی) بہن ہو تو اس بہن کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی بعد حقوق متقدمہ اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو تو اس کو دیا جائے گا۔ ورنہ پھر اسی پر رد ہو جائے گا۔) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہو گا۔ اگر (وہ بہن مر جائے اور) اس کی اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر ایسی بہنیں دو یا زیادہ ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے۔ اور ایک تہائی عصبہ کو ورنہ بطور رد کے انہی کو مل جائے گا) اور اگر (ایسی میت کے جس کی نہ اولاد ہے اور نہ والدین خواہ وہ میت مذکر ہو یا مؤنث) وارث چند (یعنی ایک سے زیادہ ایسے ہی) بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو (ترکہ اس طرح تقسیم ہو گا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دوہرا بہن کو اکہرا لیکن عینی بھائی سے علاتی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور عینی بہن سے کبھی وہ ساقط ہو جاتے ہیں، کبھی حصہ گھٹ جاتا ہے، جس کی تفصیل کتب فرائض میں ہے) اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم ناواقفی سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو تذکیر و احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (پس احکام کی مصلحتوں کو بھی جانتا ہے۔ اور احکام میں ان کی رعائیت کی جاتی ہے۔ یہ حکمت کا بیان ہے۔)

فائدہ۔

کلالہ سے متعلق ضروری باتیں سورۃ نساء کی بارہویں آیت کی تفسیر میں گزر گئیں یہاں اس آیت میں اسی تعریف کے ساتھ حقیقی بھائیوں اور علاتی بہن بھائیوں کے حصوں کا بیان ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اصول کی تعریف میں صحابہؓ کی درمیان اختلاف ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اصول کی تعریف باپ دادا منقول ہے۔ کیونکہ حضرتؓ کے نزدیک جد باپ کی غیر موجودگی میں باپ کا قائم مقام ہے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت ہے۔" فرمایا ابو بکر صدیقؓ، ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ نے کہ جد (باپ کی عدم موجودگی میں) باپ کا قائم مقام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیتیں تلاوت فرمائیں" ملۃ ابیکم ابراھیم" (29)

صحابہؓ میں اختلاف کی وجہ سے آئمہ میں بھی اختلاف ہوا۔ احناف اور حنابلہ نے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تفسیر کے مطابق اصول کو باپ دادا سمجھا اس لئے ان کے نزدیک کلالہ وہ ہے جس کا نہ باپ ہو نہ جد صحیح (وہ جد جس کے ساتھ میت کے رشتہ میں کسی عورت کا واسطہ نہ آتا ہو مثلاً دادا، پردادا، سکڑ دادا وغیرہ) اور نہ ہی میت کی کوئی اولاد ہو اس کے لئے ان آئمہ کے نزدیک باپ، جد صحیح اور اولاد میں کوئی بھی موجود ہو تو ہر قسم کے بہن بھائی ذوی الفروض اور عصبات دونوں میں محروم ہوتے ہیں لیکن امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ حضرت زیدؓ بن ثابت کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی کلالہ کی تعریف میں جد کو اب کا قائم مقام نہیں مانتے اس لئے ان کے ہاں حقیقی اور علاتی جد کے ساتھ عصبہ بن جاتے ہیں البتہ مسئلہ اکدریہ میں حضرت زیدؓ بن ثابت دادا کو بہن کے ساتھ ذوی الفروض میں حصہ دیتے ہیں(30)۔ لیکن وہ ایک استثنائی قاعدہ ہے عام قاعدہ نہیں۔ باپ اور اولاد کی موجودگی میں ہر قسم کے بہن بھائی اجماعی طور پر محروم ہیں۔ اخیافی بہن بھائی البتہ نہ صرف اولاد اور باپ کی موجودگی بلکہ جد حقیقی کی موجودگی میں بھی اجماعی طور پر محروم ہیں۔

جن حضرات نے حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کو جد کے ساتھ شریک سمجھا ہے اور اخیافی بہن بھائیوں کو نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ حقیقی بہن بھائیوں کی میت کے ساتھ یکساں قرابت ہے۔ یعنی دونوں باپ کے واسطے سے میت کے رشتہ دار ہیں۔ ایک باپ کا باپ ہے اور دوسرا باپ کا بیٹا۔ لیکن اخیافیوں بہن بھائیوں کے ساتھ جد کے برابر کا قرب نہیں کیونکہ اخیافی بھائی بہنیں ماں کے ایک واسطے سے میت کی ساتھ قرابت رکھتے ہیں

رکھتاہے اس لئے جد اخیافیوں کے لئے بالاتفاق حاجب ہے۔اس کی ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اخیافی بہن بھائی بالاتفاق ذوی الفروض ہیں اور حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں میں اگر مرد موجود ہوں تو ان کی عورتیں ان کے ساتھ عصبات بن جاتی ہیں۔پس یہ ہو سکتا تھا کہ اگر اخیافی بہن بھائی جد کے ساتھ محروم نہ ہوں تو اخیافی بہن بھائی تو بطور ذوی الفروض حصّہ لے لیں اور حقیقی اور علاتی بہن بھائی محروم ہو جائیں جیسا کہ مسئلہ حماریہ (31,32,33)میں حقیقی بہن بھائی اخیافیوں کے

مقابلے میں محروم ہوئے لیکن وہاں تو نص موجود ہے اس لئے ان کی محرومی مانی جاسکتی ہے لیکن یہاں تو کوئی نص نہیں اس لئے اس پر اجماع ہو گیا کہ اخیافی بہن بھائی جد کے موجودگی میں محروم ہوں گے کیونکہ احناف اور حنابلہ تو پہلے سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اتباع میں جد کے موجودگی میں ہر طرح کے بہن بھائیوں کے محرومی کے قائل اور شوافع اور مالکیہ مندرجہ بالا دلائل سے صرف اخیافی بہن بھائیوں کے محرومی کے قائل ہوئے۔

بعض تفاسیر میں جو کلالہ سے مراد والدین اور اولاد کا نہ ہونا لیا گیاہے فقہاء کے نزدیک یہ تفسیر مقبول نہیں اس لئے کہ کسی فقیہ نے بھی ماں کی موجودگی میں بہن بھائیوں کو محروم نہیں سمجھاہے البتہ ایک سے زیادہ بہن بھائیوں ، اولاد نیز خاوند اور باپ کی موجودگی میں ماں کا حصہ ثلث کی بجائے سدس رہ جاتاہے جیسا کہ ماں کے حصے کے بیان میں گزر چکاہے۔شوافع اور مالکیہ دادا کی موجودگی میں اخیافی بہن بھائیوں کو تو محروم سمجھتے ہیں لیکن حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کے ساتھ دادا کو عصبات میں شریک بناتے ہیں۔

اس مسئلے میں کئی مباحث آتے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ آیت نمبر12 میں لیس لہ ولد کی شرط نہیں آئی جبکہ آیت نمبر176 میں لیس لہ کی شرط موجود ہے۔نیز اگر یہ آیت کلالہ کی تفسیر ہے تو لیس لہ ولد کے لئے تو ثابت ہے لیس لہ والد کے لئے کیسے ثابت ہوئی۔اس میں اگر غور کیا جائے تو ایک سوال تو دوسرے کا جواب ہے کہ ایک آیت میں لیس لہ ولد آیا ہے اور ایک میں نہیں پس اگر لیس لہ ولد کلالہ کی شرح ہے تو پھر تو دونوں آیتوں میں ایک جیسا آنا چاہیئے تھا جو کہ نہیں ہے اس لئے لیس لہ ولد اس کی تعریف نہیں بلکہ تعریف وہی ہے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کی ہے یعنی ماخلا الولد و الوالد۔اور اس پر " اب "کی حد تک عملاً اجماع ہے البتہ ﴿ الجد اب (29)﴾ میں اختلاف ہے۔ آیت نمبر176 میں جو لیس لہ ولد آیا ہوا ہے یہ ایک تنبیہ ہے کہ

اولادِ ابی میت کو میت کی میراث میں حصّہ صرف اس وقت مل سکتا ہے جب میت کی اولاد نہ ہو یعنی اس کے لئے لیس لہ ولد ہونا ضروری ہے اور یہ بات صرف حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کے صورت میں ہوتی تھی اس لئے اخیافی بہن بھائیوں کے حق میں اس کی ضرورت نہیں تھی تو وہاں اس کا ذکر نہیں آیا۔ جہاں تک لیس لہ والد کی بات ہے تو والد کی موجودگی میں تو اس بات کا خطرہ ہی نہیں تھا تو اس کا ذکر نہیں آیا۔ پس لیس لہ ولد کلالۃ کی تعریف نہیں بلکہ کلالۃ کے لئے مخصوص حکم ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ اگر کسی نے یہ قول منسوب کیا ہے کہ ان کا مسلک لیس لہ ولد کے بنا پر الکلالۃ ماخلا الولد فقط کا تھا تو یہ خطا ہے کیونکہ ﴿آپ سے جب پوچھا گیا کہ کلالۃ کیا ہے تو آپ نے فرمایا ماخلا الولد والوالد۔ تو آپ سے جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے وإِن مرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت تو آپ کو غصّہ آیا اور سائل کو ڈانٹنے لگے اور فرمایا من لا ولد لہ ولا والد(32)﴾ اس سے صاف واضح ہوا کہ آپ کلالۃ کی تعریف وہی فرماتے تھے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے منقول ہے۔ اور آپ کے ایک فیصلے کو جس میں آپ نے جہاں تک ابن جریرؒ کی وہ روایت ہے جس میں انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ﴿ماں باپ کے ساتھ اخیافی بہن بھائیوں کو سدس دیا﴾ تو اس کا جواب صاحب اعلاء السنن نے یہ دیا ہے کہ آپؓ نے یہ اس بنیاد پر نہیں دیا کہ آپ کے نزدیک اب اخوۃ کے لئے حاجب نہیں بلکہ آپ اپنی تحقیق کے مطابق اخیافی بہن بھائیوں کو ماں کے ساتھ ثلث میں شریک کرتے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ اخوۃ کو ثلث دلواتے حالانکہ آپ نے ایک سدس ام کو اور ایک سدس اخیافی بہن بھائیوں کو دلوایا۔ اگرچہ آپ کی یہ تحقیق بھی امت میں معمول بہ نہیں ہے لیکن آپ نے اپنی اس تحقیق پر عمل کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

اس مسئلہ کو اخوہ مع الجد کا مسئلہ بھی کہتے ہیں جس کی تفصیل عصبات کے باب میں آئے گی۔ اگر ذوی الفروض سے کچھ باقی بچے اور اولاد و اجداد میں کوئی نہ ہو نیز حقیقی بھائی بہن بھی نہ ہوں تو ان میں اور علاتی بھائیوں میں وہ باقی ترکہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ " کے قاعدے سے تقسیم ہو گا۔

دو یا اس سے زیادہ حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی بھائیوں کے ساتھ عصبہ بننے میں اگرچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا اختلاف ہے۔ جیسا کہ مسروقؒ سے مروی ہے کہ ﴿حضرت عبد اللہؓ بن مسعود دو یا دو سے

حضرت زیدؓبن ثابت کو اس میں سنا تو ان کو تعجب ہوا۔اس کے بعد جب ان کے ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا آپ نے حضرت عبد اللہؓ کا قول ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے زیدؓبن ثابت کو علم میں راسخ پایا۔احمد نے کہا کہ میں نے ابی شھاب سے پوچھا کہ زیدؓبن ثابت کا قول کیا تھا تو فرمایا کہ وہ ان میں علاتی بہن بھائیوں کو (لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْن " کے طور پر) شریک کرتے تھے (33) ﴾ نیز حضرت حضرت زیدؓبن ثابت ایسی صورت میں عورتوں کو محروم کرنے کو جاہلیت کا عمل سمجھتے تھے (31) ۔بعد میں اجماع اسی پر (زیدؓبن ثابت کے قول پر) قائم ہوا ہے اس لئے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے فتویٰ پر کسی امام یا فقیہ کا عمل نہیں ہے۔ بنات اور اخوات دونوں کے بارے میں یہی فتویٰ ہے (32)

جدات صحیحہ کا حصہ

حَدَّثَنَا الْاَنْصَارِيُّ حَدَّثَنَا مَعْنٌ حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ إِسْحٰقَ بْنِ خَرَشَةَ عَنْ قُبَيْصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ جَاءَتِ الْجَدَّةُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا قَالَ فَقَالَ لَهَا مَا لَكِ فِي كِتَابِ اللهِ شَيْءٌ وَمَا لَكِ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شَيْءٌ فَارْجِعِي حَتَّى أَسْأَلَ النَّاسَ فَسَأَلَ النَّاسَ فَقَالَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ حَضَرْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَأَعْطَاهَا السُّدُسَ فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ فَقَامَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ الْاَنْصَارِيُّ فَقَالَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فَأَنْفَذَهُ لَهَا اَبُوبَكْرٍ قَالَ ثُمَّ جَاءَتِ الْجَدَّةُ الْاُخْرٰى اِلٰى عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ تَسْأَلُهُ مِيرَاثَهَا فَقَالَ لَهَا مَا لَكِ فِي كِتَابِ اللهِ شَيْءٌ وَلٰكِنْ هُوَ ذَاكَ السُّدُسُ فَإِنِ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَيْنَكُمَا وَاَيَّتُكُمَا خَلَتْ بِهِ فَهُوَ لَهَا قَالَ اَبُوعِيسٰى وَفِي الْبَابِ عَنْ بُرَيْدَةَ وَهٰذَا اَحْسَنُ وَهُوَ اَصَحُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُيَيْنَةَ "

(رواہ ترمذی)

حضرت قبیصہؓ بن ذوہیب سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ایک جدہ آئی اور اپنے لئے میراث کی طالب ہوئی۔حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں تمھارے لئے نہ تو کتاب اللہ میں کوئی چیز پا رہا ہوں اور نہ ہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ابھی چلو یہاں تک کہ میں لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھوں۔پس آپؓ نے لوگوں سے استفسار فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو چھٹا حصہ دیا ہے ۔آپؓ نے ان سے گواہ کا مطالبہ فرمایا تو محمد بن مسلمہ اٹھے اور جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا تھا اسی

طرح ہی فرمایا ہے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس کو نافذ فرمایا۔ پھر دوسری جدہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور اپنے لئے میراث میں حصہ کی طالب ہوئی تو آپؓ نے فرمایا کہ آپ کے لئے میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں کچھ نہیں پا رہا ہوں پس وہ ایک سدس ہے کہ اگر تم دونوں ہو تو تمھارے درمیان تقسیم ہو گا اور تم میں سے جو اکیلی ہو گی اس کے لئے وہ سدس ہو گی۔

عربی میں جدہ دادی اور نانی دونوں کو کہتے ہیں بلکہ ان سے بھی اوپر ان کے مؤنث اصول کو بھی جدہ کہتے ہیں مثلاً دادا کی ماں، نانی کی پرنانی، یہ سب جدات ہیں۔ البتہ جو جدات ذوی الفروض میں حصہ پا سکتی ہیں وہ صرف چند ہوتی ہیں اور ان کے تعین میں آئمہ کرام کا اختلاف بھی ہے۔ جدات کے لئے حصہ سنت اور اجماع سے ثابت ہے جیسا کہ صحابہؓ کے آثار سے واضح ہے۔

ابن وہب کا بیان ہے کہ جس جدہ کو رسول اللہ ﷺ نے حصہ دلوایا تھا وہ نانی تھی یعنی ماں کی ماں اور جو جدہ ابو بکر صدیقؓ کے پاس آئی تھی وہ بھی نانی تھی اور جو جدہ حضرت عمر کے پاس آئی تھی وہ دادی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس کا مسئلہ پوچھا تو کسی نے کچھ نہیں بتایا تو بنی حارثہ کے ایک لڑکے نے کہا کہ امیر المومنین آپ اس عورت کو اس میت کی میراث کیوں نہیں دیتے کہ اگر یہ عورت مر جاتی اور دنیا بھر کو چھوڑ جاتی تب بھی یہ مردہ اس عورت کا وارث ہوتا۔ (کیونکہ پوتا ہونے کے ناطے سے بیٹے کی غیر موجودگی میں وہی وارث ہوتا) یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس دادی کو وارث قرار دیا۔

(34)

اسی سے ملتی جلتی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں ایک روایت مؤطا اور سنن بیہقی کی بھی ہے اور وہ یوں کہ ﴿دو جدات (ایک دادی اور ایک نانی) حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس آئیں۔ آپؓ نے صرف نانی کو حصہ دینا چاہا تو ایک انصاری نے کہا کہ آپ ایسی عورت کو ایسی میت کی میراث کیوں نہیں دیتے جو اگر زندہ ہوتا اور یہ عورت مر جاتی تو وہ اس کا وارث ہوتا۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ترکہ کا 1/6 ان دونوں میں برابر بانٹ دیا (35)۔﴾ یہ اثر دار قطنی نے ابن عینیہ کے طریق سے بھی بیان کیا ہے۔ جس میں یہ بھی ہے کہ وہ انصاری عبد الرحمان بن سہل بن حارثہ تھے۔(36)۔ علماء نے لکھا ہے کہ نانی ماں کی قائمقام تھی اس لئے اس کو ماں کا کم سے کم حصہ یعنی 1/6 دیا اور دادی کو نانی پر قیاس کر کے حصہ دار بنا دیا کیونکہ وہ بھی بہر حال میت کی

اصل یعنی باپ کی ماں تھی ورنہ دادی حقیقت میں نہ ماں کی قائمقام ہو سکتی ہے نہ باپ کی کیونکہ وہ ماں کے واسطے میں نہیں آتی اور باپ کی جنس میں سے نہیں۔ اسی لئے مالکیہ اور شوافع نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ قریبی ابوی جدات دور کی اموی جدات کو محروم نہیں کرتیں۔ احناف اور حنابلہ نے ان کی اس تحقیق کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جدات کا حصہ چونکہ کتاب اللہ سے ثابت نہیں بلکہ سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ ان میں جیسا کہ اموی جدات کا حصہ سنت سے ثابت ہے اسی طرح ابوی جدات کا حصہ بھی پس راجح مرجوح کا سوال ہی نہیں رہا۔

ماں تمام جدات کو بالاتفاق محروم کرتی ہے جیسا کہ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ﴿حضور ﷺ نے میراث میں جدہ کے لئے سدس مقرر فرمایا اگر اس کو محروم کرنے والی یعنی ماں موجود نہ ہو۔(37)﴾ ان احادیث شریفہ سے پتہ چلا کہ جدہ کو اس وقت حصہ مل سکتا ہے جب ماں موجود نہ ہو اور اگر کئی جدات بیک وقت حصہ پانے کی اہل موجود ہوں تو سب کو مشترکہ طور پر ایک سدس دیا جائے گا جیسے اولاد کی موجودگی میں کئی بیویوں کو مشترکہ طور پر ثمن ملتا ہے۔ فقہائے کرام تو اس پر متفق ہیں کہ ماں ہر قسم کی جدات کے لئے حاجب ہے کیونکہ ماں جدہ کے لئے ایسی ہے جیسے جد کے لئے باپ۔ البتہ ابوی جدات کے لئے اب اور جد واسطہ کا حاجب ہونے میں اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک باپ اور جد واسطہ ابوی جدات کے لئے حاجب نہیں ہیں لیکن باقی آئمہ کرام ثلاثہ کے نزدیک حاجب ہیں۔ حنابلہ کی دلیل حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جس میں آپؓ نے فرمایا کہ ﴿حضور ﷺ نے میت کے باپ کے ہوتے ہوئے جدہ کو سدس دلوایا(38)﴾ جمہور البتہ ان کی اس تحقیق کے ساتھ متفق نہیں جمہور کا قول الاقرب فالاقرب کے ذریعے حاجب اور مجوب طے کرنے کے اصول سے مستنبط ہے۔ نیز ترمذی نے اس حدیث شریف کو ضعیف کہا ہے اس میں ایک راوی محمد بن سالم ضعیف بھی ہے۔ اس حدیث شریف کا مضمون اگر دوسری احادیث شریف سے بھی ثابت ہو جائے تو جمہور اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ممکن ہے جس جدہ کا ذکر اس حدیث شریف میں ہے وہ نانی ہو اور نانی کا بیٹا تو جد حقیقی نہیں اس لئے وہ اپنی ماں کے لئے حاجب نہیں۔ جمہور کے قول کی تائید سنن دارمی کی اس اثر سے بھی ہو جاتی ہے کہ ﴿شعبیؒ کی روایت کے مطابق حضرت زیدؓ اور حضرت علیؓ ابوی جدہ کو باپ کی موجودگی میں میراث میں حصہ نہیں دیتے تھے(39)﴾ اور سنن دارمی میں زہری کی روایت کے مطابق بھی حضرت زید بن

ثابتؓ اور حضرت علیؓ کا عمل یہی تھا۔ اور حضرت عثمانؓ سے بھی یہ ثابت ہے(40)۔ حضرت ابو عیسیٰ کے مطابق صحابہؓ میں بعض باپ کی موجودگی میں ابوی جدہ کو میراث دیتے تھے بعض نہیں( 41)۔ اتنی بات تو اجماعی ہے کہ جدہ موروثہ چاہے ایک ہو یا کئی سب کے حصوں کا مجموعہ 1/6 ہوتا ہے اور یہ بات بھی اجماع سے ثابت ہے کہ ماں کی موجودگی میں جدات محروم ہیں چاہے ابوی (باپ کی واسطے سے ) ہوں یا اموی (ماں کے واسطے سے ) ۔ اختلاف اس میں ہے کہ کون کون سی جدات حصہ پا سکتی ہیں اور کون سی نہیں۔ دوسرا یہ کہ سوائے احمد بن حنبلؒ کے باقی آئمہ ثلاثہ کے نزدیک ابوی جدات باپ اور جد واسطہ یعنی ہر وہ مرد جو میت اور اس جدہ کے درمیان رشتے میں آتا ہے کی موجودگی میں ساقط ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ جدہ کو جد پر قیاس کرتے ہوئے ماں کی غیر موجودگی میں جدہ کے لئے ماں کے حصے کے قائل ہیں جیسا کہ باپ کی غیر موجودگی میں جد کے ہوتے ہیں۔ لیکن آپؓ کے قول کو کسی فقیہ نے نہیں لیا ہے اور یہ جواب دیا ہے کہ جد مرد ہونے کی وجہ سے باپ کی غیر موجودگی میں باپ کی جگہ احناف اور حنابلہ کے نزدیک واحد عصبہ ہے اور شوافع اور مالکیہ کے نزدیک شریک عصبہ جبکہ نانی ماں کی اس طرح قائم مقام نہیں بلکہ اس کو سدس طعمہ کے طور پر ملتا ہے جو کہ عام قاعدے سے استثناء ہے کیونکہ ماں کے رشتہ داروں کو عصبات میں کچھ بھی نہیں ملتا اس لئے جدہ ماں کی غیر موجودگی میں سدس ہی لے سکتی ہے جو کہ سنت سے ثابت ہے اور یہی ابن عباسؓ سے بھی ثابت ہے(42) ۔

ابن حزم نے حضرت ابن عباسؓ کی رائے اپنائی ہے۔ ان کی رائے کے جواب میں صاحب اعلاء السنن لکھتے ہیں۔ " اور ابن حزم جو طریق ابی نعیم سے شریک سے وہ لیث سے وہ طاؤس سے اور ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جدہ ماں کی قائمقام ہے اس لئے اس کو ماں کا حصّہ دیا جائے گا جب میت کی ماں نہیں ہوگی۔ تو ہم نہیں جانتے کہ لیث بن ابی سلیم کب ان کے ہاں حجت ہوتے ہیں اور کب حجت نہیں ہوتے ہیں اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ آپؓ جدہ کو ثلث دیا کرے تھے۔ کیونکہ یہ احتمال ہے کہ آپ جدہ کو ماں کا میراث کے ثبوت اور اس کی مقدار دونوں میں قائمقام مانتے ہیں اور یہ بھی کہ میراث میں تو مانتے ہوں لیکن مقدار میں نہیں تو اس میں جدہ کے ثلث پر کوئی دلالت نہیں جبکہ دوسری طرف صحابہؓ اور تابعین جدہ کے ثلث پر متفق ہو چکے ہیں۔ ابن حزم کی اس بات کا کہ "

جدہ کے لئے سدس صرف حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمرؓ، ابن مسعودؓ، علیؓ اور زیدؓ سے مرسل روایت ثابت ہے تو اجماع کہاں ؟" صاحب اعلاء السنن اس کا جواب دیتے ہیں کہ کسی اور صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی مخالفت کو خلاف اجماع اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی روایت میں دوسری احتمال بھی موجود ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس سے زیادہ حصہ کے لئے اسی طرح کا ثبوت چاہیے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حاصل کیا تھا اور نہ حضرتؓ کا جدہ کو ارشاد تو یہ تھا کہ میں نہ تو کتاب اللہ میں تیرا حصہ پاتا ہوں اور نہ سنت میں

۔

حضرت امام ابو حنیفہ 43)ؒ) اور حضرت امام شافعیؒ مشہور قول کے مطابق (44) جدہ وارثہ (جدہ صیحہ) اس کو کہتے ہیں جس کی میت کے ساتھ رشتے کے واسطے میں کوئی جد فاسد (جد رحمی) نہ ہوں۔ اور جد رحمی وہ ہے جس کی میت کے ساتھ رشتے میں کوئی عورت آرہی ہو مثلاً نانا۔ پس ماں کی نانی تو جدہ صیحہ ہے لیکن نانا کی ماں جدہ صیحہ نہیں۔ حضرت امام مالک 45)ؒ) کے نزدیک جدہ صیحہ صرف نانی، پرنانی (نانی کی ماں)، سکڑنانی (پرنانی کی ماں)، دادی، دادی کی ماں، دادی کی نانی اور دادی کی پرنانی وغیرہ ہے۔ گویا کہ امام مالکؒ نانی اور دادی کی ماؤں اور نانیوں کی دولڑیاں بناتے ہیں جیسا کہ شکل میں بائیں طرف باریک دھاری داری مستطیل میں نظر آتا ہے۔ امام احمد بن حنبل 46)ؒ) البتہ ان کے ساتھ ایک اور لڑی کا اضافہ کر دیتے ہیں اور وہ دادا کی ماں، دادا کی نانی ، دادا کی پرنانی وغیرہ اور یہ ترتیب شکل میں پہلے سے موٹے زنجیر دار خطوط والے مستطیل میں دیکھی میں شامل کرتے ہیں۔ ان کی جدات صیحہ کی ہر پشت میں تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ پس پہلی پشت میں دو ، دوسرے میں تین، چوتھی میں چار......۔

احادیث شریفہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے تین سے زیادہ جدات کو حصّہ نہیں دلوایا(47) پس حنابلہ کا تو مالکیہ کو یہ جواب ہے کہ تین تک جدات کو تو حصّہ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ ان کا مذہب ہے۔ البتہ احناف اور شوافع اس سے بھی آگے ایک بات کرتے ہیں کہ جب جد کی ماں کو حصّہ ملا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر جد صحیح کی ماں کو حصّہ مل سکتا ہے کیونکہ احناف کے ہاں تو الجد اب ویسے ہی ثابت ہے۔ شوافع البتہ جد سے ہی ہر جد صحیح کا مطلب لیتے ہیں۔ یعنی اس جدہ کا بیٹا یا بیٹی وارث ہونا چاہیئے۔ پس ان کے ہاں ہر نانی اور ہر جد صحیح کی ماں جدہ صیحہ ہے۔ ویسے اس میں الجد اب کی صحت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ بھی ہے۔ واللہ

اعلم۔ جہاں تک اس بات کو قیاس کہہ کر رد کرنے کی بات ہے تو سچی بات تو یہ ہے کہ ان تین جدات کے علاوہ ان کی ماؤں اور نانیوں کے لئے حصّہ ثابت کرنا کیا قیاس نہیں ہے؟

جدات صحیحہ جب ایک درجہ کی ہوں تو بالاتفاق حصّہ لے سکتی ہیں (50)۔ اور جدات صحیحہ اگر ایک جہت کی ہوں تو ان میں قریب بعید کو بالاتفاق محروم کرتی ہیں مثلاً نانی، پرنانی اور دادی پر دادی کو محروم کرے گی۔(49)

اگر جہت مختلف ہوں تو قریبی مادری جدات دور کی پدری جدات کو بالاتفاق محروم کرتی ہیں (49) تاہم پدری جدات اگر مادری جدات کے مقابلے میں میت سے قریب ہوں تو اس

صورت میں آئمہ کا اختلاف ہے ۔احناف(50) ،حنابلہ(51) اور ایک قول کے مطابق شوافع(52) کے نزدیک دور والی مادری جدات محروم ہوں گی لیکن مالکیہ(45) ،شوافع کے قول صحیح(49) اور حنابلہ کی ایک روایت(49) میں قریب والی پدری جدات دور والی مادری جدات کو محروم نہیں کر سکیں گی۔ ان کے نزدیک اس کی دلیل یہ ہے کہ جہتِ ام جدات کے لئے اصل ہے یعنی یہ جدات اصل میں " ام " کے قائمقام ہیں کیونکہ " اب " کے قائمقام تو اجداد ہیں۔ دور والی جدات کو محروم کہنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ فی الاصل یہ کسی کی بھی قائمقام نہیں۔ بلکہ ان کو حصّہ بطور طعمہ ملا ہے اس لئے ترجیح کسی کو بھی نہیں دی جاسکتی ہے پس سب کو چونکہ ایک جدہ کا ہی حصّہ مل رہا ہے تو اگر کئی لینے والی ہوں تو ان میں اقرب ابعد کو محروم کرنے والی ہوں گی۔ جیسا کہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے(48)

## ذات القرابتین جدات کا حصّہ

اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ کئی جہات کا فائدہ جدات کو نہیں دیا جائے گا کیونکہ اصل میں یہ ایک ہی حصّہ ہے مثلاً حقیقی بہن اگرچہ اخیافی بہن بھی ہوتی ہے لیکن اس کو حصّہ صرف حقیقی بہن کا ہی ملتا ہے کسی اور کا نہیں۔ اس قول پر شوافع(52) اور احناف میں ابویوسف 50)ؒ) کا عمل ہے۔ اسی پر احناف کا فتویٰ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کئی جہات کا فائدہ جدات کو دینا چاہیئے کیونکہ ہر جہت ایک مختلف رشتہ بناتا ہے پس جیسا کہ چچازاد بھائی اخیافی بھائی بھی ہو تو اس کو اخیافی بھائی کا حصّہ بھی ملے گا اور چچازاد بھائی کا بھی۔ اس پر حنابلہ (اور احناف میں امام محمدؒ 50) کا عمل ہے۔ پہلے قول والے دوسرے قول والوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ

جدات کا معاملہ مختلف ہے یہ تو اصل میں ایک ہی رشتہ ہے۔ نیز جدات ذوی الفروض ہیں اور ذوی الفروض میں ایک شخص کے دو فرضوں کے لینے کی مثال نہیں۔

## عول۔

"عن ابراهيم النخعي، عن علي، و عبدالله : انهما أعالا الفرائض" رواه البيهقي (كنزالعمال)۔

" حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ الْفَرَائِضُ مِنْ سِتَّةٍ لَا نُعِيلُهَا

"رواه الدارمی

پہلی اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ عول کیا کرتے تھے۔ جبکہ دوسری اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ عول نہیں کیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں اس کی ضرورت نہیں پڑی لیکن حضرت عمرؓ کے وقت میں اا یک عورت مری اس کے خاوند، اور دو حقیقی بہنوں میں ترکے کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ خاوند کو نصف اور دو بہنوں کو دو تہائی دیں تو اصل ترکہ سے ایک سدس حصص بڑھ جاتے ہیں پس آپؓ نے صحابہؓ کرام کو مشورے کے لئے جمع فرمایا ۔ حضرت عباسؓ نے عول کرنے کا مشورہ دیا جو آپ نے قبول فرمایا۔ آپ کے دور میں اس پر صحابہؓ کا اجماع رہا لیکن آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابن عباسؓ نے اس اجماع سے انکار کیا تو باقی صحابہؓ بمع خلفائے راشدین کے حضرت عمرؓ کے فیصلے پر قائم رہے۔ اگر اہل فرائض کے حصّوں کا مجموعہ اصل ترکہ سے بڑھ جائے تو لا محالہ ہر حصّے والے کے حصّے میں اس کے حصّہ کے تناسب سے کمی کی جائے گی اور اس طرح تمام اہل فرائض کو ان کا کچھ حصّہ کچھ کمی کے ساتھ دیا جائے گا۔ ایسے مسئلہ کو عائلہ کہتے ہیں اور اس عمل کو عول۔

عول موڑنے یا جھکانے کو کہتے ہیں۔ چونکہ اہل فرائض میں باہم تعارض ہوتا ہے اور کسی کے مقررہ حصّے پر کسی دوسرے حصّے دار کو ترجیح نہیں دی جاسکتی اس لئے ترکہ کے اندر مقرر کئے ہوئے حصوں کو اصل تعداد سے موڑ کر کچھ بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو عول کہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو مسئلہ پیش آیا اس میں شوہر کو اگر حسب قاعدہ نصف اور حقیقی بہنوں دو ثلث دیا جائے تو ان کے حصّوں کا مجموعہ اصل ترکہ سے ایک سدس زیادہ یعنی 7/6 ہو جاتا ہے۔ اب ترکہ تو بڑھنے سے رہا اگر 7/6 کو 6/7 کے ساتھ ضرب دی جائے تو جواب 1 آئے گا یعنی اگر سب کے سہام کو

7/6 سے ضرب دی جائے تو ان کے حاصل ضرب حصّوں کا مجموعہ 1 آئے گا جو کہ مطلوب ہے پس اس مسئلے میں شوہر کو 7/3 اور بیٹیوں کو 3/2 کی بجائے اب 7/4 دیا جائے گا۔ماسوائے حضرت ابن عباسؓ کے جنھوں نے اسکے ساتھ حضرت عمرؓ کے وفات کے بعد اختلاف کیا عام صحابہؓ نے اس مسئلے میں یہی مسلک اختیار کیا۔

حضرت علیؓ سے جب بر سر منبر دو بیٹیوں ماں باپ اور بیوی کے درمیان تقسیم کا مسئلہ پوچھا گیا تو فوراً فرمایا بیوی کا نواں ہو گیا(53) ۔اس کو اس لئے مسئلہ منبریہ بھی کہتے ہیں۔ نیز المو فق ،المغنی، میں لکھتے ہیں " یہ عام صحابہ کا قول ہے۔ علماء اسی کو حضرات عمر، علی، عثمان، عباس، ابن مسعود، زید رضی اللہ عنھم سے روایت کرتے ہیں اور اسی پر حضرت امام مالک کی روایت سے اہل مدینہ کا عمل بتاتے ہیں۔ نیز لکھتے ہیں کہ اسی پر اہل عرا ق کا فتوی تھا اور اسی طرف ہی امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔ یہی سفیانؒ ثوری، اسحاقؒ، نعیمؒ بن حمادؒ اور ابو ثورؒ کا فیصلہ ہے پس اس قول پر فقہاء کا اجماع ہے سوائے حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ اور معدودے چند فقہاء نے جن میں محمد بن حنفیہ، محمد بن علی بن حسین، عطا اور داود رحمھم اللہ کا نام کتابوں میں ملتا ہے نے جمہور کے ساتھ اختلاف کیا اور انہوں نے کہا کہ عول نہ کیا جائے۔" حضرت ابن عباسؓ کی توجہ جب ان کی رائے کی طرف فرمائی گئی تو فرمایا" کہ جو شخص صحرا عالج کے ذرات کو گن سکتا ہے وہ مال کو آدھا آدھا کرنے کے بعد اس میں ایک ثلث مزید کیسے نکال لیتا ہے ؟۔" حضرت کا ارشادہ اس مسئلے کی طرف تھا جس میں ایک عورت ماں شوہر اور ایک حقیقی بہن کو چھوڑ مری ان شوہر اور حقیقی بہن کو نصف نصف قرآن کے مطابق دے دیں تو ترکہ ختم ہو جاتا ہے ماں کا ثلث جو قرآن سے ہی ثابت ہے کہاں سے دیں۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جنھوں نے سب پہلے عول کیا وہ عمرؓ تھے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدم رکھا ہے ان کو مقدم رکھا جائے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے موخر کیا ہے ان کو موخر رکھا جائے تو عول کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ جب آپؓ سے پوچھا گیا کہ کس کو اللہ تعالیٰ ان کو مقدم کیا ہے اور کس کو موخر ؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقدم رکھا ہے کہ انکا حصّہ اگر اللہ نے کسی جگہ گرایا ہے تو کسی اور حصہ کی طرف منتقل کیا ہے وہ محروم بالکل نہیں ہوتے مثلاً زوجین، ام وغیرہ اور موخر ان کو رکھا ہے کہ کسی سبب سے جب ان کا مقررہ حصہ گرایا گیا تو پھر ان کے لئے کوئی معین حصّہ نہیں مقرر فرمایا مثلاً بیٹیاں اور اخوات وغیرہ۔"(54) دوسرے لفظوں میں حضرت کی نظر میں

حضرت ابن عباسؓ کا مسلک اس میں یہ ہے کہ اگر سب کو ان میں حصہ نہیں دیا جاسکتا تو جو مقدم ہیں ان کو تو پورا دیا جائے اور جو موخر ہیں ان کے لئے دیکھا جائے کہ مقدمین سے کچھ بچتا ہے یا نہیں اگر بچتا ہے تو وہ ان کو دے دیا جائے ورنہ وہ محروم ہو جائیں گے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے قرضوں کی قسمیں ہیں تو اگر سب کے لئے ترکہ کافی نہ ہو تو پہلی قسم والا قرض پہلے ادا کیا جائے۔ اگر ان سے کچھ بچا تو دوسری قسم کے قرض خواہوں کو دیا جائے گا ورنہ وہ محروم رہیں گے۔

عول کے قائلین کہتے ہیں کہ اگر زوج، ماں اور دو اخیافی بہنوں میں ترکہ تقسیم کرنا پڑے تو شوہر کو نصف ماں کو ثلث اور دونوں اخیافی بہنوں کو ثلث دیا جائے گی کیونکہ ان میں کوئی ایسا نہیں جن کا حصّہ گرایا جاسکتا ہو پس یا تو عول کرنا پڑے گا یا ماں کا اخیافی بہنوں کی وجہ سے حصّہ کم کرنا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کے خلاف عمل کرنا پڑے گا اس لئے اس کو الزامی مسئلہ بھی ہیں۔ نیز جس طریقے سے فرائض ثابت ہیں اس طریقے سے حضرت ابن عباسؓ کی تعریف مقدم اور مؤخر ثابت نہیں اسی لئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کو مقدم کیا ہے اور کس کو مؤخر؟۔ پس اپنی رائے سے نص قرآنی میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ اس کے برعکس قرآنی تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو ورثاء کے حصص کے درمیان نسبت پر محمول کرنا زیادہ آسان تھا اس لئے جمہور نے یہی کیا۔ نیز اکابر صحابہؓ کی رائے حضرت عمرؓ کے عہد میں عول کے حق میں قائم ہو چکی تھی جس کے شروع کرنے والے ان کے والد حضرت عباسؓ تھے اس لئے صحابہؓ نے جب حضرتؓ سے استفسار فرمایا کہ آپؓ نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں کیوں اختلاف نہیں کیا تو حضرتؓ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ بہت پر ہیبت شخصیت تھے ان کی ہیبت کے وجہ سے ایسا نہیں کیا تو صحابہؓ نے فرمایا کہ آپ کی وہ رائے جو جماعت کے ساتھ تھی ہمیں زیادہ مقبول ہے اس رائے سے جو آپ کی جماعت سے مختلف ہے۔ آج کل بھی بعض حضرات جن کو شاذ روایات کو اپنانا زیادہ پسند ہوتا ہے وہ اس واقعے کا سہارہ لے کر اہل سنت میں اس پر موجود اجماع کو چھیڑنا چاہتے ہیں اور صحابہؓ کے دور میں اس طے شدہ مسئلے کو اپنے فہم ناقص کے مطابق دوبارہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو خدا سے اس معاملے میں ڈرنا چاہیئے۔ اگر کسی ایک دو مسئلوں میں چند متخصص حضرات کو ایسا پیش آجائے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کو پیش آیا تو اس کو تو تفرد پر محمول کیا جاسکتا ہے

لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ صحابہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کی رائے بھی اجماع کے مقابلے میں نہیں مانی تو ان کی بات کی کیا حیثیت ہے۔اس کو شذوذ پسندی کہتے ہیں جو ایک مرض ہے اور اس سے بچنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے نتائج اس شخص کے لئے اور پوری امت کے لئے بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ایک صاحب نے تو کمال کیا کہ علامہ جصاصؒ کی آیت نمبر 11 کی تفسیر سے استنباط کرتے ہوئے عول کا انکار کیا حالانکہ اسی آیت سے خود حضرتؒ عول کی دلیل پیش فرمارہے ہیں۔انہوں نے جس اقتباس کو اپنے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اس سے چند سطریں آگے علامّہ جصاصؒ فرماتے ہیں وکذالک الابن یستحق جمیع المال لو انفرد فاذا اجتمعا ضرب الابن بجمیع المال والبنت بالنصف فیکون المال بینھما اثلاثاً وھکذا سبیل العول فی الفرائض عند تدافع السھام واللہُ اعلم۔

پس علامہ موصوف تو اسی آیت سے عول کا قرآنی ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ ایک ابن کو اگر 1 اور بنت کو 1 / 2 سے ضرب دیا جائے تو دونوں کا مجموعہ 3 / 2 ہو جائے گا لیکن چونکہ ان دونوں کا مجموعہ 1 ہی ہونا چاہیۓ پس اس کو 1 بنانے کے لئے اس کو 2 / 3 سے ضرب دینا پڑے گا جو اس وقت ممکن ہے کہ ابن اور بنت دونوں کے حصّوں کو بھی 2 / 3 سے ضرب دی جائے۔اس طرح ابن کا حّصّہ 2 / 3 اور بنت کا حصّہ 1 / 3 ہو جائے گا اور عول میں بھی یہی ہوتا ہے۔علامہ موصوف تو وھکذا سبیل العول فی الفرائض عند تدافع السھام کہہ کر اس سے عول ثابت کرتے ہیں اور ان ہی کی تحریر سے آج کے مجتھد جب عول کے خلاف ثابت کرتے ہیں تو بے اختیار زبان پر یہ دعا جاتی ہے ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وحب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔دوسری طرف بعض آجکل کے عقلمندوں نے اپنی ناقص عقل کے بنیاد پر عول کے مسئلے کو بنیاد بنا کر قرآن پر اعتراض کیا ہے اور اپنے زعم میں ثابت کیا ہے کہ قرآن کے پاس اس قسم کے مسائل کا حل نہیں۔ان عقل کے اندھوں سے اگر کہا جائے کہ کسی کے ذمّے ایک شخص کے 1000 روپے، دوسرے کے 500 اور تیسرے کے 800 روپے ہوں اور وہ شخص دیوالیہ ہو جائے تو اگر اس کے پاس صرف 1000 روپے ہوں تو ان سے قرض خواہوں کی ادائیگی کیسے کی جائے گی۔لازمی بات ہے کہ اس رقم میں سے ہر ایک کو اگر ان کے قرضوں کے تناسب سے ادائیگی کی جائے گی تو یہی قرین انصاف ہو گا تو یہی حل صحابہ نے بھی تو پیش کیا۔کس اتھارٹی سے پیش کیا تو یہ الگ موضوع ہے اور مختصراً اس کے بارے میں اتنا کہنا

دی اور پیارے نبی ﷺ نے علیکم بسنتی و سنت خلفاء راشدین فرما کر خلفاء راشدین کو دین کی تشریح کا اختیار دے دیا۔ واقعہ یوں ہوا کہا سوائے چند اہل ظاہر کے ( ابن حزم اور داؤد وغیرہ ) باقی اہل سنت کا عول پر فتویٰ دیا ہے۔ اس لئے عول پر اہل سنت کا اجماع ہے کیونکہ اہل ظاہر قیاس کو مانتے نہیں اور اس مسئلے میں وہ قرآن کے مقابلے میں قیاس کر رہے ہیں۔

## رد

حَدَّثُنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ حَدَّثُنَا سُفْيَانُ عَنْ مُحَمَّدُ بْنِ سَالِمٍ عَنِ الشَّعْبِي اَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ كَانَ لَايَرُدُّ عَلٰى اَخٍ لِاُمٍّ مَعَ اُمٍّ وَلَا عَلٰى جَدَّةٍ اِذَا كَانَ معهَا غَيْرُهَا مَنْ لهٗ فَرِيْضَةٌ وَلَا عَلٰى ابْنَةِ الصُّلْبِ وَ وَلَا عَلٰى امْرَأَةٍ وَزَوْجٍ وَ كَانَ عَلِيٌّ يُرَدُّ عَلٰى كُلِّ ذِىْ سَهْمٍ اِلَّا الْمَرْأَةَ وَالزَّوْجَ (رَوَاهُ دارمی)

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود ماں کی موجودگی میں اخیافی بہن بھائیوں، کسی بھی دوسرے ذوی الفروض کی موجودگی میں جدہ پر، اور بیٹیوں کی موجودگی میں پڑپوتیوں پر اور زوج اور زوجہ پر رد نہیں کرتے تھے جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہ سوائے زوج اور زوجہ کے باقی سارے ذوی الفروض پر رد کرتے تھے۔ رد کا مطلب ہے لوٹانا، عربی میں اس کا مترادف رجع ہے پس جو ترکہ ذوی الفروض سے بچ گیا اگر عصبات موجود نہ ہوں تو پھر ان کو ہی لوٹایا جاتا ہے اور جس کی کل مال میں جتنی نسبت بنتی ہے اتنا ہی اس میں سے ان کو دیا جاتا ہے مثلاً ایک بیٹی ہے اور ایک بیوی ہے۔ بیوی کا آٹھواں ہے اور بیٹی کا نصف۔ ان دونوں کو اپنا اپنا حصّہ دینے کے بعد 3/8 پھر بھی بچتا ہے۔ اب اس 3/8 کا آٹھواں بیوی کو مزید ملے گا اور اسی 3/8 کا نصف بیٹی کو مزید ملے گا۔ اس کو اصطلاح میں رد کہتے ہیں۔ صاحب " الاستذکار" کے نزدیک اسی پر سوائے حضرت زیدؓ کے باقی صحابہؓ کا عمل تھا۔ المغنی بھی اس کو عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنھم کا عمل بتاتے ہیں اور اس پر حسن، ابن سیرین ، شریح، عطاء، مجاھد، ثوری ابی حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور حنابلہ رحمھم اللہ کا عمل بتاتے ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت ذوی الفروض سے جو بچتا تھا وہ بیت المال کو دلواتے۔ آپؓ کے نزدیک چونکہ حصّے قرآن میں طے ہو چکے ہیں اس لئے ان میں زیادتی نہیں ہو سکتی۔ نیز رد کے مانعین کی یہ بھی دلیل ہے کہ فرائض منصوص ہیں رائے کی بنیاد پر اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ جمہور کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ۔ اور حدیث شریف جس نے مال کو چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جس نے کچھ بوجھ (قرض

وغیرہ) ہو وہ ہمارے لئے ہے(55) ، یہ کل مال کے لئے ثابت ہے پس اگر ذوی الفروض سے کچھ مال بچ گیا تو وہ بیت المال سے زیادہ ورثاء کا حق ہے پس ان پر رد کیا جائے سوائے زوج اور زوجہ کے جو ذوی الارحام میں نہیں۔ دوسرے اشکال کا جواب قائلین یہ دیتے ہیں کہ رد فرائض میں اضافہ نہیں بلکہ سبب مختلف سے اصحاب الفروض کو دینا ہے جیسا کہ اصحاب الفروض کو اپنا اپنا حصّہ دینے کے بعد اگر ترکہ میں کچھ بچ جائے تو اگر اصحاب الفروض میں عصبہ بھی بن سکتا ہو تو اسی کو بطور عصبہ باقی بھی دے دیتے ہیں تو اس کو کون ذوی الفروض میں اضافہ سمجھتا ہے ؟ اسی طرح جب عصبات میں بھی کوئی نہ ہوں تو بیت المال سے پہلے ان ورثاء کا حق زیادہ بنتا ہے جو وارث ہیں۔ احناف( 43)اور حنابلہ( 51) کا رد پر فتویٰ ہے جبکہ مالکیہ اور شوافع کے متقدمین رد کے حق میں نہیں لیکن شافعیہ(56) اور مالکیہ(45)کے متاخرین نے بھی بیت المال منتظم نہ ہونے کی بنا پر احناف کا فتوٰی اپنا لیا۔ احناف حضرت علیؓ کے اتباع میں سوائے زوج اور زوجہ کے سب پر رد کرتے کیونکہ ان کے نزدیک باقی سارے ذوی الفروض کا حصّہ چونکہ بطور فرض نسباً ثابت ہے اس لئے ان میں اب کوئی وجہ امتیاز نہیں اس لئے سب پر رد کیا جائے گا۔ جبکہ حنابلہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے پیروی میں ماں کی موجودگی میں اخیافی بہن بھائی، بیٹی کے موجودگی میں پوتی، حقیقی بہن بھائی کے موجودگی میں علاتی بہن بھائی، کسی بھی دوسرے ذوی الفروض کی موجودگی میں جد اور زوج یا زوجہ پر رد نہیں کرتے۔ حضرت عثمانؓ سے گو کہ زوج پر بھی رد ثابت ہے لیکن جمہور نے اس کو نہیں لیا کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ ممکن ہے جو زوج تھا اس کو بطور عصبہ دیا ہو۔

## عصبات

يُوصِيكُمُ اللهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (النساء 11)

میراث کی آیات کریمہ کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے جو کہ عصبات کا سب سے پہلا قانون بتاتا ہے اس لیئے یوں کہنا کہ عصبات کا حصّہ قرآن سے نہیں بلکہ احادیث شریفہ سے ثابت ہے غلط ہے۔ عصبہ پٹھے کو

کہتے ہیں اور اصطلاح میں باپ کی طرف کے رشتہ داروں کو عصبات کہتے ہیں۔ یہ کئی قسموں پر ہیں جن کا ترتیب وار تعارف کیا جاتا ہے۔

## عصبہ بنفسہ

حَدَّثَنَا مُوسٰى بْنُ اِسْمٰعِيلَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ حَدَّثَنَا بْنُ طَاوُسٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْحِقُوا الْفَرَايِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ متفق علیه

آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرائض کو اپنا اپنا حصّہ دے دو اور جو باقی بچے وہ سب سے پہلے (مستحق) مرد کو دے دو۔ پس وہ مرد جو ذوی الفروض کے بعد ما بقی کے مستحق ہیں عصبہ بنفسہ کہلاتے ہیں یعنی ان کو عصبہ بنانے کے لیئے کسی اور کی موجودگی ضروری نہیں مثلاً بیٹا یا کوئی بھی نرینہ اولاد، باپ اور اجداد صحیحہ، بھتیجے، چچازاد بھائی اور اجداد صحیحہ کے بھائی اور ان کی نرینہ اولاد۔ خاوند اور اخیافی بھائی کے علاوہ باقی تمام مرد ورثاء یا تو عصبہ ہوتے ہیں یا مثلاً نرینہ اولاد، بھائی اور ان کی نرینہ اولاد، چچا اور ان کی نرینہ اولاد، اجداد صحیحہ کے بھائی اور ان کی نرینہ اولاد یا ذوی الفروض اور عصبہ دونوں ہوتے ہیں مثلاً باپ اور اجداد صحیح۔ ان میں الاقرب فالاقرب کا قانون لاگو ہوتا ہے پس ان میں ترتیب کے مطابق جو پہلے موجود ہوگا وہی ذوی الفروض سے بچے ہوئے سارے ترکہ کا مستحق ہوگا۔ ترتیب کو سمجھنے کے لیئے پہلے تو قرآن کریم سے استدلال کیا گیا ہے۔ قرآن میں يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلاَدِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ میں اولاد میں مرد اور عورتوں دونوں کی موجودگی کی صورت کا قانون بتایا گیا ہے جس میں مردوں کا حصّہ عورتوں سے دگنا بتایا گیا ہے۔ پھر عورتوں کے بارے میں حکم ہے کہ مردوں کی غیر موجودگی میں جب اکیلی ہو تو کتنا لے گی اور جب ایک سے زیادہ ہوں گی تو کتنا لیں گی لیکن مرد جب عورتوں کے بغیر ہوں تو اس کے بارے میں اس آیت مبارک میں خاموشی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (57)ؒ کے نزدیک یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر صرف نرینہ اولاد موجود ہو تو باقی سارا مال اس کا ہے اگر ایک ہو تو سارا اس کا نہیں تو سب برابر برابر تقسیم کریں گے۔ کیونکہ بیٹے کو محروم تو کیا نہیں جا سکتا کہ وہ میت کا سب سے قریبی مرد ہے جس کو از روئے حدیث باقی سارا مال دینے کا حکم ہے۔ قاضی صاحب نے ایک وجہ اور بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تنہا لڑکی کا حصّہ نصف مقرر کیا تو تنہا مرد کا اس کا دگنا ہونا چاہیئے جو کہ کل ہے۔ اس میں ایک بات کا خیال رکھنا البتہ ضروری ہے کہ لڑکی اگر تنہا ہو تو اس کو سارے ترکے کا نصف ملے گا جبکہ لڑکے کو سارا ترکہ نہیں بلکہ جتنا

ذوی الفروض کو دینے کے بعد بچتا ہے وہ سارے کا سارا ملے گا کیونکہ اسی مشہور حدیث شریف سے یہی ثابت ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ سب سے پہلا مرد (عصبات میں مستحق) بیٹا ہے۔ پھر پوتا، پڑپوتا، سکڑپوتا وغیرہ جتنا بھی نیچے تک ہو وہ ہے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا فتویٰ ہے کہ " اگر کسی متوفّی نے (صرف) بیٹا چھوڑا تو اس کا سارا ترکہ اس کا ہے، اگر دو بیٹے چھوڑے تو وہ ان میں برابر تقسیم کیا جائے گا اور اگر بیٹے بیٹیاں چھوڑے تو ان میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم ہو گا اور اگر کوئی ولد صلبی نہیں چھوڑا اور پوتے پوتیاں چھوڑے تو ان میں پھر ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم ہو گا اور وہ صلبی اولاد کی غیر موجودگی میں ان کے قائمقام ہوں گے اور اگر بیٹا موجود ہو تو پوتے کا کوئی حصّہ نہیں۔ اس طرح اگر پوتے چھوڑے اور اور ان سے اسفل اولاد نرینہ بھی تو ان پوتوں کی موجودگی ان سے اولاد نرینہ اولاد کو کچھ نہیں ملے گا یعنی اولاد ادنیٰ کو اولاد اعلیٰ کے موجودگی میں کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر باپ اور بیٹا چھوڑا ہے تو باپ کو سدس دیا جائے اور باقی بیٹے کا ہو گا اور اس طرح بیٹا نہیں بلکہ پوتا چھوڑا تو پوتا بیٹے کا قائمقام ہو گا۔ " (59)

والد کے بارے میں تقریباً یہی صورت حال ہے فرق اتنا ہے کہ اگر میت کی اولاد موجود ہو تو والد کے لئے ذوی الفروض میں ﴿وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ کے ارشاد کے مطابق 1/6 حصّہ مختص کیا جائے گا لیکن اگر میت کی اولاد نہ ہو تو ﴿فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ کے مطابق ماں کا حصّہ تو ثلث یعنی 1/3 مختص کیا جائے گا لیکن والد کے حصّے سے سکوت ہے۔ یہاں بھی یہ سکوت دلالت کر رہا ہے کہ ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصّہ دینے کے بعد جتنا ترکہ باقی بچتا ہے وہ والد کا ہے کیونکہ اس وقت ولد یعنی میت کی اولاد تو موجود نہیں جو اس کے لیئے عصبات میں حجاب بن سکے اس لیئے قریب ترین مرد ہونے کی وجہ سے باقی سارا ترکہ اس کا ہے جبکہ میت اولاد ہونے کی صورت میں اولاد اس کے لیئے عصبات میں حاجب بنتا اس لئے اس کا حصّہ اس وقت ذوی الفروض میں پکا کر دیا گیا۔ یہاں قرآن میں عصبات کے نظام کی تائید کا ایک مخفی اشارہ موجود ہے غور کرنے کی بات ہے۔ اہل تشیع کا یہ تحریفی مقولہ کہ " عصبہ کے منہ میں خاک " کے بودے پن کی اور دلائل کے علاوہ یہ بھی ایک دلیل ہے۔

اگر والد نہ ہو تو احناف اور حنابلہ کے نزدیک تو جد صحیح باپ کا قائمقام ہے اس لیئے اس کو اسی طریقے سے ملے گا جس طرح باپ کو ملے گا اور اس کے ساتھ بہن بھائی شریک نہیں ہوں گے لیکن شوافع اور مالکیہ کے نزدیک اور صاحبین کے نزدیک بھی جد صحیح کے ساتھ بہن بھائی شریک ہوں گے۔ یہ اختلاف اخوہ مع الجد کے اختلاف سے مشہور ہے اس پر چونکہ علیحدہ باب دیا جارہا ہے اس لئے اس کو وہیں سے مطالعہ کیا جائے۔

اس کے بعد جو عصبات ہیں ان پر امت میں اجماع ہے جس کے بارے میں مؤطا امام مالک کی ایک روایت میں تفصیل موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ " حقیقی بھائی علاتی بھائی سے اور علاتی بھائی حقیقی بھائی کے بیٹے سے اولیٰ ہے اور حقیقی بھائی کا بیٹا علاتی بھائی کے بیٹے سے اولیٰ ہے۔ علاتی بھائی کا بیٹا حقیقی بھائی کے پوتے سے اور حقیقی بھائی کا پوتا علاتی بھائی کے پوتے سے اولیٰ ہے۔ علاتی بھائی کا پوتا (نرینہ اولاد جتنا بھی نیچے ہو) حقیقی چچا سے اولیٰ ہے اور حقیقی چچا علاتی چچا سے اولیٰ ہے اور علاتی چچا حقیقی چچا کی نرینہ اولاد سے اور حقیقی چچا کی نرینہ اولاد علاتی چچا کی نرینہ اولاد سے الخ (60)۔ اسی ترتیب سے عصبات کا شجرہ ترتیب دیا گیا ہے جو کہ صفحہ نمبر پر موجود ہے۔

## عصبہ بغیرہ

جس ترتیب میں اوپر عصبات بیان کیے گئے ہیں اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ جیسا کہ لکھا گیا کہ ان عصبات کو عصبہ بنفسہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ عصبہ بننے میں کسی اور کے محتاج نہیں بلکہ خود ان کا وجود ہی عصبہ ہونے کا ثبوت ہے بخلاف ان عورتوں کے جو خود تو ذوی الفروض ہوتی ہیں لیکن عصبہ بنفسہ کی موجودگی میں عصبہ بنتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو عصبہ بغیرہ کہتے ہیں جیسے بیٹی بیٹے کی موجودگی میں اور بہن بھائی کی موجودگی میں عصبہ ہے۔ اس کی مستدل آیتیں سورۃ نساء کی آیت نمبر 11 اور آیت نمبر 176 ہیں۔

آیت نمبر 11 میں بتایا گیا ہے کہ بیٹے اور بیٹیاں اگر دونوں موجود ہوں تو بیٹوں کا حصہ بیٹیوں سے دگنا ہو گا۔ پوتے پوتیاں، پڑپوتے پڑپوتیاں، سکڑپوتے سکڑپوتیاں اپنے سے اقرب اولاد کی غیر موجودگی میں بیٹے کی قائم مقام ہیں اس لئے ان کے لئے بھی یہی حکم ہے اور اس پر اجماع ہے۔ تکملۃ الثلثلین کے بعد اگر ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصہ دینے کے بعد کچھ بچتا ہے تو پہلی دفعہ اولاد نرینہ میں سے جو بھی ملیں گے وہ اگر صرف مرد ہیں تو باقی سارا کچھ وہی لیں گے اور اگر برابر کی یا اس سے اوپر کی ایسی زنانہ اولاد موجود ہو جن کو ذوی الفروض میں

حصہ نہیں ملا تو ان کو اپنے ساتھ للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدے سے شریک کر دیں گے کیونکہ اگر اس کی برابر کی عورتیں حصہ لے رہی ہوں تو اس سے اوپر کی عورتیں کیسے محروم ہوں گی اس پر بھی اجماع منعقد ہو چکا ہے۔اس کو فقہ کی کتابوں میں مسئلہ تشبیب بھی کہتے ہیں۔

تکملۃ الثلثلین کے بعد یعنی ایک سے زیادہ بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیوں کو یا ایک بیٹی اور پوتیوں کی موجودگی میں ان سے نیچے کی زنانہ اولاد مثلاً پڑپوتیوں وغیرہ کو عصبات میں عصبہ مع غیرہ کے طور پر حصہ مل سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک تو جواب نفی میں ہے جیسا کہ اثر میں ہے کہ:﴿ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیٹیوں کے ساتھ پوتوں اور پوتیوں کو ایسا شریک کرتی تھیں کہ بیٹیوں کو دو تہائی دیتیں اور جو باقی بچتا اس میں سے پوتوں اور پوتیوں کو (حسب قاعدہ ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾) شریک کرتی تھیں اور فرمایا کہ (اولاد کی غیر موجودگی میں) بہنوں کے لئے بھی یہی قانون ہے۔ (32)﴾

سنن دارمی کے دوسرے اثر میں یہی مضمون اسی طریقے سے آیا ہے کہ:﴿حضرت مسروقؒ کو اپنے سفر مدینہ منورہ میں جب حضرت زیدؓ بن ثابتؓ کے میراث میں علم کا اندازہ ہوا اور انہوں نے آپؓ کو حقیقی بہنوں کو دو تہائی دینے کے بعد بھی علاتی بہن بھائیوں میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الاُنْثَيَيْن کی قاعدے سے) شراکت کا قائل پایا تو انہوں نے پرانا مسلک (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی پیروی کا) تبدیل کیا جس کا انہوں نے صحابہؓ کے استفسار پر ذکر کیا۔(33)﴾ بعد میں فقہا کا اجماع حضرت زیدؓ بن ثابت کی تحقیق پر ہوا جیسا کہ اسی اثر (33) میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

آیت نمبر 176 میں کلالہ کی میراث بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بہن بھائی جب ملے جلے ہوں اور ان کو محجوب کرنے والے ورثاء یعنی باپ اور اولاد (اجماعی) اور دادا (اختلافی) موجود نہ ہو تو بھائی کو بہن کے مقابلے میں دگنا دیا جائے گا۔ان میں اخیافی بہن بھائی تو آیت نمبر 12 کی اجماعی تفسیر کے مطابق ذوی الفروض ہیں اس لئے آیت نمبر 176 میں بہن بھائی سے مراد بالاجماع حقیقی اور علاتی بھائی ہیں ورنہ تعارض آئے گا جو کہ قرآن میں محال ہے۔ پھر علاتی بھائی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں محجوب ہیں جیسا کہ سنن دارمی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ:﴿اخیافی اور حقیقی بہن بھائی آپس میں ایک

دوسرے کی میراث پاتے ہیں لیکن علاتی بہن بھائی نہیں اسطرح ایک شخص اپنے حقیقی بھائی کی میراث تو پاتا ہے لیکن علاتی بھائیوں کی نہیں (34) اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے البتہ ذوی الفروض میں اگر حقیقی بہن ایک ہو تو علاتی بہنیں بھی تکملۃ الثلثلیین کے لئے ایک سدس پاسکتی ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ علاتی بھائی نہ ہوں اور اگر ہوں تو وہ ان کو اپنے ساتھ عصبہ بنالیں گے۔

اگر حقیقی بہنیں ایک سے زیادہ ہوں اور علاتی بہنوں کے ساتھ علاتی بھائی نہ ہوں تو وہ بالکل محروم ہو جائیں گی اس صورت میں باقی ترکہ ذوی الفروض پر رد کیا جائے گا ان علاتی بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا تاہم علاتی بھائیوں کی موجودگی میں وہ عصبہ بننے کی اہل ہوں گی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اس آخری شق کے ساتھ اختلاف فرماتے ہیں۔ حضرتؓ کی نزدیک اگر ایک دفعہ بنات یا اخوات میں ثلثیین کا تکملہ ہو گیا تو پھر بنات اور اخوات کو عصبات میں کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ (32) جو کچھ بھی باقی ہو گا وہ صرف مرد عصبات کا حق ہو گا لیکن آپؓ کا یہ قول کسی بھی فقیہ نے نہیں لیا اس لئے میراث کا مستعمل قانون اجماعی طور پر وہی ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا۔

اولاد کے بعد میت کے باپ اور اجداد صیحہ کی باری ہے اور جو ان میں سب سے قریب ہو۔ دلیل وہی حدیث شریف ہے۔ باپ کے بارے میں امت کا اجماع ہے کہ اولاد نہ ہو تو جو ذوی الفروض سے باقی بچے سب اس کا ہے۔ اگر اولاد ہو تو پھر ماں باپ کا چھٹا تو (بحوالہ آیت نمبر 11 سورۃ نساء) ذوی الفروض میں ثابت ہی ہے تاہم اولاد اگر نرینہ نہیں صرف زنانہ اولاد ہے تو اس صورت میں اگر ذوی الفروض کو دینے کے بعد پھر بھی کچھ بچتا ہے تو وہ باپ کے لئے ہو گا کیونکہ عورتیں عصبات میں صرف عصبہ مع غیرہ بن سکتی ہیں عصبہ بنفسہ نہیں۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آرہی ہے۔ احناف اور حنابلہ کے نزدیک اجداد صیحہ میں جو جد میت کے سب سے قریب ہو وہ والد کی غیر موجودگی میں اس کا قائمقام ہے ان کی دلیل حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی وہ حدیث شریف ہے جس میں آپؓ نے اپنی رائے بیان فرمائی کہ جد باپ کا قائمقام ہے۔ (35) اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اس کی تائید فرمائی تھی (36) اور حضرت عثمانؓ نے اس کو حضرت عمرؓ کے رائے سے بہتر سمجھا (37) لیکن حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت علیؓ کا استدلال ہے کہ جد بھائیوں کے ساتھ شریک ہے (38) جس کے طریقے میں پھر حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کا اختلاف ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو فرائض میں ایک

خاص درک حاصل تھا جس کی تعریف آنحضرت ﷺ نے فرمائی تھی اور حضرت علیؓ باب العلم ہیں شاید اس اس لئے شوافع اور مالکیہ کی رائے جد اور اخوہ کی شرکت کی طرف ہوگئی لیکن دوسری طرف حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی رائے جد کے قائم مقام کا بیان فرماتے ہیں جن کی حضور ﷺ نے یہاں تک تعریف فرمائی ہے کہ اگر میں انسانوں میں کسی کو خلیل بناتا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کو بناتا(35) اور اس کی تائید حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسے مفسر قرآن نے فرمائی(36) اور یہ مسئلہ پہلے تفسیر قرآن سے متعلق ہے بعد میں اس کا استعمال بعد میں اس کا استعمال فرائض کے لئے ہوا ہے کیونکہ اس کی تشریح کلالہ کی تفسیر پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ باوجود کوشش کے حضرت عمرؓ کو صحابہؓ کی اجماعی رائے حاصل نہیں ہوسکی تو حضرت عمرؓ نے آخر میں اس ارادے کو ترک فرمادیا اور اس کو تکونیات رب کا کرشمہ قرار دیا۔ ان تمام تفصیلات کو جب سامنے رکھا جاتا ہے تو احناف اور حنابلہ کی رائے میں کافی وزن آجاتا ہے۔ اس کی باقی تفصیل اخوہ مع الجد کے باب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

عصبہ مع غیرہ۔ ﴿حضرت معاذؓ نے یمن میں ایک بیٹی اور بہن میں نصف نصف تقسیم کیا اور ان دنوں حضور ﷺ حیات تھے(45)﴾۔ اس طرح ﴿ایک شخص ابو موسیٰؓ اور سلمان بن ربیعہؓ کے پاس آیا اور اب سے پوچھا کہ اگر بیٹی ایک پوتی اور حقیقی بہن رہ جائے تو ان میں میراث کیسے تقسیم ہوگی۔ فرمایا کہ بیٹی کو نصف دو اور باقی حقیقی بہن کو دو اور ساتھ یہ فرمایا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی پوچھ لیناوہ اس میں ہمارا ساتھ دیں گے تو وہ شخص حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا اور ان سے ایسا ہی ذکر کیا جیسے کہ ان دونوں نے فرمایا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں گمراہ ہوجاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں رہوں گا اگر ایسا کروں تو اس میں ایسا ہی فیصلہ کروں گا جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا اور وہ یہ کہ بیٹی کو نصف اور پوتی کو سدس دو تہائی کو پورا کرنے کے لئے (کیونکہ بنات کا حصہ ذوی الفروض میں دو تہائی تک ہوتا ہے) اور حقیقی بہن کو وہ(ایک ثلث) جو باقی رہ جائے(46)﴾ اور اسی فیصلے پر اجماع ہے۔ ان آثار سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقی بہن حقیقی بھائی کی غیر موجودگی میں بھی عصبہ بن سکتی ہے ایسی عورتیں جو خود تو ذوی الفروض ہوں لیکن اور عورتوں کے ساتھ عصبہ بن جائیں ان کو عصبہ مع غیرہ کہتے ہیں جیسے یہاں بنات کے ساتھ حقیقی بہن کو عصبہ بنایا گیا۔ بغیرہ میں غیر مذکر ہے جو برابر کا مرد ہوتا ہے اور مع غیرہ میں غیر مؤنث ہے جو کہ بنات ہیں۔

اس قانون میں بھی علمائے کرام کا اختلاف وارد ہوا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اخوات کو بنات کے ساتھ عصبہ بنانے کے قائل نہیں۔ آپؓ کے قول پر داؤد ظاہری اور ایک جماعت کا فتویٰ ہے۔ آپؓ کے نزدیک یہ قرآن کی سورۃ نساء کی آیت نمبر 176 کے ساتھ اختلاف ہے کیونکہ اس میں اخت کا حصہ اس وقت ملتا ہے جب میت کی اولاد نہ ہو۔ پس آپؓ فرماتے ہیں کہ ہم اولاد کی موجودگی میں اخوات کو کیسے حصہ دیں لیکن جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ پابندی صرف ذوی الفروض کی حد تک ہے عصبات پر یہ پابندی نہیں۔ ذوی الفروض میں چونکہ کوئی بھی اولاد کی موجودگی میں اخوات کے حصے کا قائل نہیں اور عصبات میں ان کو دینے کے لئے حضرت معاذؓ (45)، حضرت زیدؓ بن ثابت (47) اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود (46) کے آثار کافی ہیں جن میں حضرت معاذؓ کا فیصلہ آنحضرت ﷺ کے وقت میں ہوا ہے اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے اپنے فیصلے کو حضور ﷺ کے فیصلے کے مطابق بتایا ہے اس لئے یہ قرآن کے ساتھ اختلاف نہیں ہے۔ نیز حقیقی یا علاتی بھائی مؤنث اولاد کے ساتھ بالاجماع عصبہ بنتا ہے حالانکہ وہاں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ قرآن میں "﴿وھو یرثھا ان لم یکن لھا ولد﴾" کی وجہ سے اولاد کی موجودگی میں اس کو کلیتاً محروم ہونا چاہیے لیکن ایسا مراد نہیں لیا گیا تو یہاں بھی قرآن کی مخالفت نہیں آئمہ اربعہ کا اس لئے اس پر اجماع ہے کہ بنات کے ساتھ اخوات عصبہ بن سکتی ہیں۔ دوسرا اختلاف حضرت اسحٰق راھویہ اور ان کے ہمنوا کی طرف سے ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے فیصلے (46) اور حدیث شریف ﴿ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ پہلے مستحق مرد کو دو﴾ کو جمع کیا جائے پس اگر مذکر عصبات موجود نہ ہوں تو پھر اخوات کو بنات کے ساتھ عصبہ بنایا جاسکتا ہے۔ جمہور نے اس کو بھی تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ آخر الذکر حدیث عام حدیث ہے اور اول الذکر حدیث شریف اس سے استثنا ہے جیسا کہ حدیث شریف " عورت اپنے آزاد کردہ، اپنا لاوارث پالے ہوئے اور اپنے ابن ملاعنہ بیٹے کی میراث پاتی ہے (48)، اس عام حدیث شریف سے استثناء ہے۔

نرینہ اولاد اور والد کی موجودگی میں حقیقی بہنیں ہر طرح سے محروم ہوتی ہیں اور جد کی موجودگی میں احناف اور حنابلہ کی نزدیک محروم ہوتی ہیں لیکن شوافع اور حنابلہ کے نزدیک جیسا کہ گزر گیا جد کو ایک بھائی فرض کرکے اس کے ساتھ شریک ہوتی ہیں۔ اس کی تفصیل اخوہ مع الجد کے باب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حقیقی بہن بھائیوں کے غیر موجودگی میں علاتی بہن علاتی بھائی کے ساتھ عصبہ بغیرہ اور بنات کے ساتھ عصبہ مع غیرہ بنتی ہے لیکن حقیقی بہنیں اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو اب یہ علاتی بھائی کے ساتھ عصبہ مع غیرہ کے طور پر ہی حصہ پاسکتی ہیں باقی کسی طرح سے بھی نہیں کیونکہ حقیقی بہنوں نے اخوات کا انتہائی حصّہ دو تہائی حصّہ وصول کرلیا اب عصبہ مع غیرہ کے طور پر کسی قسم کی اخت کو نہیں مل سکتا نہ ذوی الفروض میں نہ عصبات میں۔ کیونکہ ان کا مونث غیر اپنے حصّے کا تکمیل کر چکا ہے البتہ مذکر غیر پر چونکہ کوئی حد نہیں ان کے لئے تو وہی حدیث شریف ہے جسکا مفہوم ہے کہ ذوی الفروض سے جو باقی بچے وہ پہلے مرد کو دیں۔ یہ مرد اگر اولاد میں سے ہے یا اخوہ میں سے ہے تو اولاد میں تو اپنے ساتھ برابر کی عورت اور اپنے سے میت سے زیادہ قریبی ان عورتوں کو بھی شریک کرلے گا۔ اگر حقیقی بہن صرف ایک ہو اور حقیقی بھائی کوئی نہ ہو نیز میت کا والد اور نرینہ اولاد بھی نہ ہو تو اس صورت میں علاتی بہن اس کے ساتھ عصبہ بن سکتی ہے۔ احناف اور حنابلہ کے ہاں اس کے لئے دادا کی غیر موجودگی بھی ضروری ہے۔

اگر اولاد نرینہ موجود نہ ہو نہ ہی اجداد ہوں اور نہ ہی حقیقی اور علاتی بہن بھائی موجود ہوں تو ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصہ دینے کے بعد جو بچتا ہے وہ سب سے پہلے مرد کو دیا جائے گا۔ کما فی الحدیث جو موجودہ صورت میں حقیقی بھتیجا ہے وہ نہ ہو تو علاتی بھتیجا، وہ نہ ہو تو حقیقی بھتیجے کا بیٹا... ۔یعنی پھر ان حقیقی اور علاتی بھائی کی دوسری اولاد جس میں قانون یہ ہے کہ میت کے ساتھ جو زیادہ قریب ہو وہ مستحق ہے اور قرب میں برابری ہو تو حقیقی علاتی پر مقدم ہے۔ اگر بھائیوں کی اولاد میں کوئی نہ ہو تو باپ کی اولاد میں ان دو قوانین پر قریبی کو تلاش کیا جائے گا۔ ان میں بھی نہ ہو تو دادا کی اولاد میں، نہیں تو پڑدادا کی اولاد۔ وہاں بھی نہ ہو تو سکڑ دادا کی اولاد میں۔ پس جو بھی پہلے ملے اس کو سارا مال دیا جائے گا۔ اگر کئی قوت قرابہ اور قرب درجہ میں مساوی ہوں تو ان سب میں برابر برابر مابقی کو تقسیم کیا جائے گا۔

اس طریقہ تقسیم کو شجرہ نادب میں دکھایا گیا جہاں سے یہ عصبات کا نظام بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس پر اجماع ہے اور اس کی تفصیل مؤطا امام مالک (49) میں موجود ہے۔

# اخوہ مع الجد کا مسئلہ

یہ مسئلہ بھی حجب کے ضمن میں آتا ہے لیکن اس میں اختلاف میں جانبین کی طرف سے کافی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لئے فقہ کی کتابوں میں اس کو علیحدہ باب میں دیا جاتا ہے۔ اس کے بارے بنیادی بحث توکلالہ اور "الجد اب" کی تھی جو کہ گزر گئی یہاں اس کی کچھ مزید تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں جن کا ذکر وہاں مناسب نہ تھا یہاں جد سے مراد جد صحیح اور اخوہ سے مراد صرف حقیقی اور علاتی بہن بھائی ہیں۔ اس کے بارے میں چونکہ قرآن اور سنت میں کوئی واضح حکم نہیں آیا اس لئے صحابہؓ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے بارے میں فیصلہ کرنے سے ڈرتے بھی رہے اور اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے اس کے بارے رائے بھی دیتے تھے اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے منسوب ایک روایت ہے کہ ﴿جو چاہے کہ جہنم کے گہرائی میں گھس جائے تو وہ جد اور اخوہ کا فیصلہ کر دیں۔﴾ سب سے پہلے اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رائے دی کہ جد اب کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں کسی صحابیؓ نے بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ اختلاف نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں گو کہ اس مسئلے میں اختلاف کا ارادہ فرمایا تھا لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حیا کی وجہ سے اختلاف نہ کر سکے۔ ایک دفعہ صحابہؓ کو اس کے بارے میں ایک رائے پر متفق کرنے کے لئے بلایا لیکن سانپ کے نکلنے سے سب منتشر ہوگئے اس کے بعد حضرتؓ نے اس کو رب کا ایک تکوینی کرشمہ سمجھ کر امت کو اس میں مختلف الرائے چھوڑنے میں بہتری سمجھی۔

حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ، عبد اللہ ابن زبیرؓ اور اکثر اکابر تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رائے سے متفق رہے لیکن حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ جد کے ساتھ اخوہ کو شریک کرتے تھے البتہ ہر ایک کا جد کو اخوہ کے ساتھ شریک کرنے کا طریقہ مختلف تھا۔

# حضرت علیؓ کا طریقہ

اگر جد کے ساتھ صرف اخوات ہوں یا حقیقی اخوات کے ساتھ علاتی اخوہ اخوات بھی ہوں تو اخوات کو ان کا فرض حصہ دینے کے بعد باقی اگر جد اکیلا ہو تو بطور عصبہ حاصل کرے گا وگرنہ علاتی اخوہ اخوات کے ساتھ ایک بھائی کے طور پر اس کا مقاسمہ ہو گا تاہم جد کا حصّہ اگر ایک سدس سے کم بنے تو اس کو سدس بطور فرض دلوا کر باقی علاتی اخوہ اخوات میں ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾ کے مطابق تقسیم ہو گا۔

اگر حقیقی بھائی موجود ہوں تو جد کو ایک بھائی سمجھ کر اخوہ اخوات کے ساتھ اس کا مقاسمہ کیا جائے تاہم اس کا حصّہ اگر ایک سدس سے کم بنتا ہو تو اس کو سدس بطور فرض دلوا کر مابقی حقیقی بہن بھائیوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے طریقے پر تقسیم ہو گا۔ حقیقی بہن بھائیوں میں کوئی نہ ہوں تو علاتی بہن بھائی حقیقی بہن بھائیوں کے قائمقام ہوں گے۔

حضرت زید بن ثابتؓ کا طریقہ۔

اس طریقے کے مطابق مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے جس میں جد کا فائدہ ہو اختیار کیا جائے۔

1۔ جد کو بھائی سمجھ کر ان میں مقاسمہ۔

2۔ ذوی الفروض کو اپنا اپنا حصہ دینے کے بعد ثلث الباقی۔

3۔ کل مال کا چھٹا۔

جد کے ضرر کے لئے علاتی بہن بھائیوں کو جد کے ساتھ حساب کرتے ہوئے شریک کیا جائے گا لیکن جب بہن بھائی آپس میں حساب کریں گے تو حقیقی بہن بھائی حسب قاعدہ علاتی بہن بھائیوں کے لئے حاجب ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا طریقہ

اگر جد کے ساتھ صرف اخوات ہوں تو حضرت علیؓ کے طریقے پر عمل کیا جائے اور اگر جد کے ساتھ صرف اخوہ ہوں تو ان کا جد کے ساتھ مقاسمہ ہو گا اور اگر اخوہ کے ساتھ دوسرے ذوی الفروض بھی ہوں تو حضرت زیدؓ کے طریقے پر عمل کیا جائے۔ اس طریقے میں حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقوں کو جمع کیا گیا ہے۔

اخوہ مع الجد کے قائلین میں ہر طریقے پر بعض کا فتویٰ ہے لیکن حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقے پر امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور صاحبین کا فتویٰ ہے اور احناف اور حنابلہ اخوہ مع الجد کے قائل ہی نہیں۔ ان کے نزدیک جد باپ کی غیر موجودگی میں باپ کا قائم مقام ہے اس لئے ان کے ہاں جد کی موجودگی میں ہر قسم کے بہن بھائی محروم ہیں۔

## جانبین کے دلائل

جو حضرات اخوہ مع الجد کے قائل ہیں ان کے نزدیک چونکہ بھائیوں کا حصہ نص سے ثابت ہے اس لئے ان کو محروم کرنے کے لئے برابر درجے کا نص چاہیے۔ جو اس کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ اخیافی بہن بھائیوں کا حصہ بھی تو نص سے ثابت ہے ان کو پھر جد کی موجودگی میں کس نص کے ذریعے محروم کیا جارہا ہے۔

قائلین فرماتے ہیں کہ جد بھی باپ کے واسطے سے میت کا رشتہ دار ہے اور بھائی بہنیں بھی باپ کے واسطے کیونکہ وہ ان کا باپ ہے اس لئے ان کا استحقاق برابر ہونا چاہیے۔ جو قائلین نہیں وہ فرماتے ہیں نہیں جد اصل ہے تو جیسے نسل یعنی پوتا بیٹے کی غیر موجودگی میں بیٹے کا قائم مقام ہے اس طرح اصل یعنی جد باپ کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہونا چاہیئے کیونکہ دونوں کو میت کے ساتھ عمودی نسبت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جیسے قرآن میں یابنی آدم اسفل کی اعلیٰ اولاد کی قائمقامی پر دلالت کرہی ہے اس طرح ملۃ آبائی ابراہیم سے جد صحیح کی اب کی قائمقامی ثابت ہورہی ہے جبکہ اس طرح کا ثبوت بھائیوں کے لئے نہیں پیش کیا جاسکتا نیز بھائی ذوی الفروض کی کثرت میں محروم ہوجاتے ہیں لیکن جد نہیں بلکہ اس کا سدس برقرار رہتا ہے جس سے جد کے مقابلے میں اخ کے رشتے کا ضعف محسوس ہورہا ہے۔

کلالہ کی تفسیر اگر ماخلا الولد و الوالد جیسا حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رائے ہے کی جائے تو پھر اخیافی بہن بھائیوں کا جد کے ذریعے محجوب ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن حقیقی اور علاتی بھائیوں کے لئے اگر ایسا نہیں تو اس فرق کی دلیل کیا ہوسکتی ہے حالانکہ دونوں جگہ لفظ کلالہ آیا ہوا ہے۔ اخوہ مع الجد میں اگر جد کو اخوہ کے لئے حاجب نہ مانا جائے تو اس کے لئے کوئی ایک قاعدہ کلیہ واضح نہیں ہوسکا۔ اول تو طریقہ کار میں عظیم اختلاف پھر ایک طریقے کے اندر قانون کی بار بار تبدیلی یہاں تک کہ حضرت زیدؓ بن ثابت کے طریقے میں مسئلہ اکدریہ جب لاینحل مسئلہ بن گیا تو اس کے لئے ایک دفعہ جد کی موجودگی میں بہن کو ذوی الفروض بنایا گیا تو پھر اسی وقت

جد اور اخوہ کے درمیان تقسیم کے وقت للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ استعمال کیا گیا پس اب اگر جد کو بھائی مانتے ہیں تو بہن کو ذوی الفروض میں کیسے حصہ ملا اور اگر جد بھائی نہیں تو ان میں للذکر مثل حظ الانثیین کیسے ؟ نیز علاتیوں کا حقیقیوں کا جد کو بھائی کے مقابلے میں شرکت اور پھر آپس میں حقیقیوں کا علاتیوں کے لئے حاجب ہونا یہ تمام اس مسئلے کو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے رائے کے مقابلے میں کمزور ثابت کر رہی ہے پھر حضرت عمرؓ کا اس رائے کو ظاہر کرنے سے حجاب اور پھر صحابہؓ کے سانپ کی وجہ سے منتشر ہونے سے اس کو تکوینی طور پر ویسے چھوڑنے کا ذہن بنانا یہ سب اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حضرت صدیقؓ کی رائے کو اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین میں کوئی خاص مقام حاصل ہے۔ نیز امام ابو حنیفہؒ اپنے عمق فکر کے لئے اتنے مشہور تھے کہ ان کو بعض نے قیاس کہا اور امام احمدؒ اپنے مسلک اتباع ظاہر حدیث کے لئے اتنے مشہور ہیں کہ ان کو بعض نے اہل حدیث کہا اور فقہا کے گروہ میں شامل نہیں کیا حالانکہ یہ دونوں قسم کے اقوال ان دو بزرگوں کے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ نہ تو امام ابو حنیفہؒ قیاس تھے اور نہ ہی امام احمدؒ فقہا کے گروہ سے باہر، لیکن یہ دونوں اقوال اس بات کی غمازی ضرور کر رہی ہیں ہ کہ اول الذکر تو منشاء اور معنی کی تلاش کے لئے مشہور تو آخر الذکر اتباع حدیث کی کھلی نشانی۔ اب ان دونوں بزرگوں کا اس مسلک پر متفق ہونا ان دو مکاتیب فکر کا اس پر جمع ہونا ہے۔ جہاں تک امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا تعلق ہے تو ان حضرات پر حضرت زید بن ثابتؓ کی جلالت شان کا بہت اثر ہے کیونکہ آپؓ کو فرائض کے معاملے میں ایک خاص درک حاصل تھا لیکن دیکھا جائے تو بات واقعی صحیح بھی ہے کہ حساب کے ساتھ حضرتؓ کی مناسبت تو مسئلہ اکدریہ سے ہی واضح ہو جاتی ہے لیکن کلالہ کی تعریف میں اصولیات کے ایسے احاطہ کی ضرورت تھی کہ ایک تعریف تمام شقوں کا احاطہ کرے جو کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ہی حصہ تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بہت کم احادیث مروی ہیں لیکن جو احادیث آپؓ سے مروی ہیں وہ معرکۃ الاراء ہیں۔ نیز آپؓ کی قوت فیصلہ کا پتہ اس وقت چلتا تھا کہ امت کسی ایسی امر میں متردد ہو جاتی کہ اس کا حل کسی اور کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت آپؓ ایسا فیصلہ فرمادیتے جس کو بعد میں سب تسلیم کر لیتے تھے۔ سارے صحابہؓ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور نور ہیں اور ان میں کسی کا بھی اتباع حق کا اتباع ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی کی اتباع کی بھی اجازت دی ہے تو پھر افضل البشر بعد الانبیاء کا اتباع ہی کیوں نہ کیا جائے اور اس قول کی دلیل خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کا ارشاد مبارک ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کی رائے کے جواب میں فرمایا کہ ہم آپ کی

رائے کا اتباع کریں گے تو یہ رشد ہے اور اگر شیخ ( صدیقؓ ) کی رائے پر عمل کریں گے تو یہ دونوں آراء میں بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

## مَسئلہ مُشَرَّکہ یا مَسئلہ حِمارِیہ

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ یُوسُفَ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ عَنْ مَنْصُورٍ و الاَعْمَشِ عَنْ اِبرَاهِیمَ ثُمَّ فِیْ زَوْجٍ وَاُمٍّ وَاِخْوَةٍ لِاَبٍ وَاُمٍّ وَاِخْوَةٍ لِاُمٍّ قَالَ کَانَ عُمَرُ وَعَبْدُ اللهِ وَزَیْدٌ یُشَرِّکُونَ وَقَالَ عُمَرُ لَمْ یَزِدْهُمُ الاَبُّ اِلَّا قُرْبًا رَوَاهُ دَارِمِی

۔حضرت عمرؓ کے وقت میں زوج، ماں، حقیقی بھائیوں اور اخیافی بھائیوں کے درمیان میراث تقسیم کرنے یہ مشکل پیش آئی کہ معمول کے مطابق اگر زوج کو نصف، ماں کو سدس اور اخیافی بھائیوں کو ثلث دیتے ہیں تو ترکہ ختم ہو جاتا ہے اور حقیقی بھائی محروم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی بھایئوں نے کہا کہ اے عمر ہمارا والد گدھا سہی لیکن ہماری ماں تو اخیافی بھائیوں کے ساتھ شریک ہے تو ان کو ہمارے اوپر کیوں فوقیت ہے ؟۔ حضرت عمرؓ ان کی دلیل سے متاثر ہوئے اور ان کو بھی اخیافی بھائی قرار دے کر اخیافی بھائیوں کے ساتھ حصّہ دلوایا جیسا کہ اثر میں ہے حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے تو یہ مسلک اپنایا لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہ نے بوجوہ اختلاف کیا اس لئے ان کے نزدیک ایسی صورت میں حقیقی بھائی محروم ہوں گے۔ یہی احناف کا مسلک ( 131) ہے اور حنابلہ ( 118) کا مسلک ہے جبکہ شوافع (119 ) اور مالکیہ (114 ) نے حضرت زیدؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا مسلک اپنالیا۔

دیکھا جائے تو حقیقی بھائی عصبہ ہیں اور عصبہ کی تعریف یہ ہے کہ کبھی سب لیں گے، کبھی زیادہ کبھی کم اور کبھی بالکل نہیں جبکہ ذوی الفروض کا اپنا حصّہ ہوتا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ پس اگر نص نے کسی کو ذوی الفروض بنایا ہو تو اس کو کوئی عصبہ نہیں بنا سکتا ہے اور جو از روئے نص عصبہ ہو وہ ذوی الفروض نہیں ہو سکتا پس ایک جذباتی تاثر سے نص کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور یہی حضرت علیؓ کی دلیل تھی جس پر قیاس یعنی منشاء کے بادشاہ امام ابو حنیفہؒ اور اتباع حدیث کے سرخیل امام احمدؒ دونوں کا فتوٰی ہے۔

یہاں پر ذوی الفروض اور عصبات نسبی کا ذکر ختم ہو جاتا ہے اس کے اجمالی قواعد بھی معلوم ہو گئے۔ ان ہی قواعد کو آسانی سے سمجھنے کیلئے فہم المیراث مکمل میں تین طریقے اور دو جداول دیئے گئے ہیں ۔ان کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ یہاں پر دوبارہ ان کو لکھنا تحصیل حاصل ہو گا۔

# عصبات سببی

عصبہ سببی اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شرعی سبب کی بناء پر عصبہ قرار پایا ہو جیسے مولی العتاقہ چنانچہ اگر کوئی آزاد کردہ غلام مر جائے اور وہ اپنا کوئی عصبہ نسبی نہ چھوڑے تو اس کا آزاد کرنے والا مرد ہو یا عورت اس آزاد شہ غلام (میت) کا عصبہ قرار پائے گا، اور ذوی الفروض سے بچا ہوا مال بحثیت عصبہ سببیلے گا۔ چونکہ اس آزاد کنندہ کا میت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے وہ عصبہ سبی کہلاتا ہے۔ اس آزاد کنندہ کی عدم موجودگی میں اس کے عصبہ بنفسہ اس غلام (میت) کے عصبہ سبی ہوں گے، البتہ آزاد کرنے والے کے عصبات میں عورتوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس معتق یعنی آزاد کرنے والے کو (مولی العتاقہ) کہتے ہیں۔ معتق اپنے آزاد کردہ غلام کے ترکہ کا اس وجہ سے حق دار ہوتا ہے کہ وہ اس کو آزادی دے کر گویا اک ( نئی ) زندگی عطا کرتا ہے اور اس طرح حکماً باپ بیٹے کا سا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ آزاد کردہ غلام مر جائے اور اس کا کوئی عصبہ نسبی موجود نہ ہو تو س کے ترکہ کا وارث اس کا معتق قرار پاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ولاء نسبی سلسلہ کی طرح ایک نسبی شاخ ہے (143)۔ احناف کے نزدیک عصبات نسبی کے غیر موجودگی میں مولیٰ العتاقہ ان کا قائمقام ہوتا ہے۔

مولیٰ عتاقہ کے بارے میں صحابہ ؓ کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا ہے کہ مولیٰ عتاقہ ذوی الارحام پر مقدم ہے اور مذکورہ عصبات کا آخری عصبہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ذوی الارحام مولیٰ عتاقہ پر مقدم ہیں۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان سے استدلال کیا ﴿ واولو الارحام ﴾۔ احناف حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مذکورہ آیت سے حکم موالات کو منسوخ کیا گیا ہے جس کے زریعے رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد انصار اور مہاجرین کے درمیان بذریعہ مواخات (موالات) باہم وراثت قائم کراتی تھی۔ اس آیت کے ذریعے واضح فرمادیا گیا کہ موالات کے عقد سے رحم کا رشتہ مقدم ہیں اس کے احناف بھی قائل ہیں کہ عقد موالات سے ذوی الارحام مقدم ہیں لیکن مولیٰ عتاقہ ذوی الارحام سے بھی مقدم ہیں جس کی بنیاد وہ حدیث ہے جو دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی نے ایک غلام آزاد کیا تھا۔ یہ غلام ایک لڑکی چھوڑ مرا تھا تو حضور ﷺ نے نصف اس لڑکی کو دے کر باقی نصف حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو دلوائی۔ (102)

اس حدیث شریف کی تائید ایک اور حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے ﴿کہ ولاء اس کے واسطے سے ہے جس نے آزاد کیا(100)﴾۔ بحر الرائق میں رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ بالا روایت کے الفاظ "ولاء بھی ایک رشتہ ہے جیسا کہ نسب ایک رشتہ ہے(101) " آزاد کنندہ کو عصبہ ثابت کرتا ہے۔ مولیٰ العتاقہ عصبات نسبی کے غیر موجودگی میں عصبہ قرار پاتا ہے اور وراثت کا مستحق ہوتا ہے ۔مالکیہ (138)،شافعیہ (119)،حنبلیہ (139) اور ظاہریہ (140) بھی عصبہ نسبی کی غیر موجودگی میں مولیٰ عتاقہ کے میراث کے قائل ہیں۔ اس طرح شیعہ امامیہ بھی اس کے قائل ہیں۔

## ذوی الارحام

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ الانفال آیت نمبر75۔

اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت اور جہاد کیا تو وہ آپ میں سے ہیں اور بعض رشتہ دار بعضوں کے مقابلے میں خدا کی کتاب میں اولیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ سارے چیزوں کو اچھی طرح جاننے والے ہیں۔

اَخْبَرَنَا اِسْحٰقُ بْنُ مَنْصُورٍ اَخْبَرَنَا اَبُو عَاصِمٍ عَنْ ابْنِ جُرَيْجٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ طَاوُوسٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولِ ﷺ اَلْخَالُ وَرِثُ مَنْ لَاوَارِثَ له ▪ وَهٰذا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ وَقَدْ اَرْسَلَه ▪ بَعْضُهُمْ وَلَمْ يَذْكُرْ فِيهِ عَائِشَةَ وَاخْتَلَفَ فِيهِ اَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ فَوَرَّثَ بَعْضُهُمْ خَالَ وَالخَالَةَ وَالْعَمَّةَ وَاِلٰى هٰذا الحَدِيثِ ذَهَبَ اَكْثَرُ اَهْلِ الْعِلْمِ فِي تَوْرِيثِ ذَوِى الاَرْحَامِ وَاَمَّا زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَلَمْ يُوَرِّثْهُمْ وَجَعَلَ الْمِيْرَاثَ فِي بَيْتِ الْمَالِ ترمذی ما جاء فی میراث الخال ،حدیث رقم 1929۔

آیت کریمہ میں لفظ ارحام رحم کی جمع ہے اور لغت میں مطلق رشتہ داری کو کہتے ہیں اس لئے اولو الارحام سے مراد اکثر مفسرین نے ذوی القرابۃ (رشتہ دار) لیا ہے چاہے ذوی الفروض یا عصبات یا کوئی اور اور اثر میں جو لفظ ذوی الارحام آیا ہے یہ اصطلاح میں ان رشتہ داروں کو کہتے ہیں جو نہ تو ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات۔

اس اثر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اگر کسی کا کوئی اور وارث نہیں تو اس کا خال اس کا وارث ہو گا۔ اس طرح ایک اور اثر میں یہ مضمون ذرا مختلف طریقے سے بیان ہے اس کا مفہوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا﴿ اللہ اور رسول اس کا مولیٰ ہے جس کا کوئی مولیٰ نہ ہو اور خال اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو (69)﴾ پس یہاں دو باتیں ذکر ہوئیں ایک یہ کہ اگر کسی کا کوئی اور وارث نہ ہو اس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ جس کے ذوی الفروض اور عصبات نہ ہوں کیونکہ ان کی موجودگی میں میراث میں کسی اور کچھ نہیں مل سکتا دوسری یہ کہ پھر خال اس کا وارث ہو گا۔ اب خال چونکہ نہ تو ذوی الفروض میں آتا ہے نہ عصبات میں پس یہ جو کچھ بھی ہے تو اس کی توریث ثابت ہو گئی۔ دوسری طرف اسی اثر میں ہی صحابہ کرامؓ کے درمیان ذوی الارحام کو میراث دینے میں اختلاف کا ذکر ہے پس بعض صحابہؓ نے تو خال، خالہ اور عمّہ کو میراث دلوایا ہے جبکہ حضرت زیدؓ بن ثابت نے ذوی الفروض اور عصبات کی غیر موجودگی میں بقیہ مال بیت المال کو دلوایا اور ذوی الارحام کو محروم کیا۔ دیکھا جائے تو ذوی الارحام کی میراث میں کئی طرح کے اختلاف ہیں۔

1- اول یہ کہ ذوی الارحام کو میراث مل سکتی ہے یا نہیں۔

2- اگر مل سکتی ہے تو کیا عصبات کی طرز پر یا ذوی الفروض کی طرز پر یا کسی اور طرز پر۔

3- ان پر بھی الاقرب فالاقرب کا قانون لاگو ہوتا ہے یا نہیں؟

جہاں تک پہلے اختلاف کا تعلق ہے تو الموفق " المغنی " میں لکھتا ہے کہ:

" ابو عبد اللہ ذوجین کے علاوہ ذوی الفروض اور عصبات کی غیر موجودگی میں ذوی الارحام کو میراث دلواتے تھے اور یہی روایت حضرات عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی درداؓ کی جاتی ہے۔ اسی پر شریح، عمر بن، عبد العزیز، عطاء، طاؤس علقمہ، مسروق اور اہل کوفہ رحمھم اللہ کا فتویٰ ہے۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ ذوی الارحام کو میراث نہیں دلواتے تھے بلکہ بیت المال کو دلواتے تھے۔ اسی پر حضرات مالک، شافعیؒ، ابو ثور، داؤد اور ابن جریر کا فتویٰ ہے" ۔ تابعین میں سے ابراہیم، ابن سیرین، حسن بصری اور مجاہد رحمھم اللہ بھی ذوی الارحام کو وارث مانتے ہیں، اور عراق کوفہ اور بصرہ کے فقہاؑ بھی۔ اہل بیت، امام ابو حنیفہؒ، صاحبین اور امام احمدؒ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ہر دو فریقوں کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

## قائلین کے دلائل۔

(وَ أُولُوا الْاَرْحَامِ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِی کِتَابِ اللّٰہِ۔)

( اور رشتہ دار آپس میں حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں ) اگرچہ الوالارحام سے مراد یہاں مطلقاً رشتہ دار ہیں صرف اصطلاحی ذوی الارحام نہیں لیکن اس سے یہ تو پتہ چلا کہ غیر رشتہ داروں کی موجودگی میں وہ لوگ جن کو عرف میں رشتہ دار کہتے ہیں زیادہ مستحق ہوں گے اور اگر اس کو عام معنی میں لیا جائے تو سارے مسلمانوں جو کہ میت کے کسی نہ کسی طریقے سے رشتہ دار ہی ہیں گو دور کے سہی کو مراد لیا جائے گا۔ ان میں جو عرف کے رشتہ دار ہیں مثلاً خالہ پھوپھی وغیرہ باقی دور کے رشتہ داروں جن پر عرفاً رشتہ داری کا اطلاق نہیں ہوتا ہے کے مقابلے میں میت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اب بیت المال جو کہ عام مسلمانوں کا مال ہوتا ہے ان کو اگر میت کی میراث دی جائے گی تو ان معروف رشتہ داروں کی جو میت کے زیادہ قریب ہیں حق تلفی ہو جائے گی کیونکہ "للرجال نصیب مما ترک الوالدین و الاقربون" میں اقربون کا لفظ عام ہے پس ان اقربون کے پہلے مصداق تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کا حصہ کتاب اللہ اور سنت قائمہ میں موجود ہے لیکن اگر وہ موجود نہ ہوں تو ان کے بعد وہ لوگ جن کا حصہ کتاب اللہ میں تو نہیں لیکن ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لائق توجہ ہیں جو ان کے مقابلے میں میت سے زیادہ دور ہیں۔

کئی احادیث شریفہ میں یہ وارد ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ ﴿خال (ماموں) اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو کہ وہ اس سے میراث لیتا ہے اور اس کو دیتا ہے﴾ اور یہ صاف ظاہر ہے کہ خال نہ تو ذوی الفروض میں ہے اور نہ عصبات میں ہے پس اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ خال سے مقدم ورثاء اگر موجود نہ ہوں تو خال وارث ہو گا جو کہ ذوی الارحام ہے جس سے ذوی الارحام کی توریث ثابت ہو جاتی ہے۔

جو حضرات توریث ذوی لارحام کے قائل نہیں ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ﴿قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ وَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ (14)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا تو وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ پس جن کا حصہ مقرر تھا ان کا حصہ کتاب اللہ میں آ گیا اور جن کا حصہ کتاب اللہ میں نہیں وہ وارث نہیں۔

اس طرح حدیث شریف میں یہ بھی وارد ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو فرمایا ہے کہ خالہ اور پھوپھی کا میراث میں کوئی حصہ نہیں اور حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ ﴿70﴾

جس میں حضرت عمرؓ تعجب کا اظہار فرمارہے ہیں کہ عمہ کا میراث تو لیا جاتا ہے لیکن اس کو میراث نہیں ملتا اور چونکہ یہ دونوں اصطلاحی ذوی الارحام ہیں اس لئے ذوی الارحام کو دینا کتاب اللہ اور احادیث شریفہ سے ثابت نہیں۔ جو حضرات ذوی الارحام کو میراث دینے کے قائل ہیں وہ ان دلائل کا جواب یوں دیتے ہیں کہ جن کا حصّہ کتاب اللہ میں آگیا وہ وارث ہیں اور جن کا نہیں آیا وہ وارث نہیں اس کی تاویل وہ یوں کرتے ہیں کہ ہاں وہ اصل ورثاء میں شامل نہیں یعنی وہ ذوی الفروض اور عصبات نہیں لیکن اگر ذوی الفروض اور عصبات موجود نہ ہوں تو پھر ذوی الارحام کو دینے سے اس حدیث شریف کی مخالفت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ خال جو کہ ذوی الارحام ہے اس کو دینا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ بعض حضرات نے خال کے بارے میں یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ شاید وہ عصبہ بھی تھا اس لئے خال کو میراث دی گئی لیکن ابن قیمؒ کے نزدیک اس کا ابطال اس سے ہوجاتا ہے کہ جب حکم کو خال پر معلق کیا گیا ہے تو اگر وہ عصبہ اور ذی رحم دونوں ہوتا تو بلاغت اس میں تھی کہ اس کی عصبیت کا ظاہر کیا جاتا نہ کہ اس کا ذوی الارحام ہونا کیونکہ یہ اس کا غالب حال ہے موجودہ صورت میں وارث سے غیر وارث کی طرف جانے سے حضور ﷺ کا کلام منزہ ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی بتایا ہے کہ اس سے مراد سلب ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بھوک اس کا طعام ہے اگر اس کے پاس کچھ نہ ہو اس لئے اس سے مراد یہ ہوسکتا ہے کہ کسی کا خال کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار نہ ہو تو اس کا کوئی وارث نہیں لیکن یہ استدلال بھی عجیب ہی ہے کیونکہ احادیث شریف میں اس کے ساتھ یہ بھی آیا ہے کہ "یرثہ" یعنی اس کی میراث لیتا ہے پس اس سے سلب مراد لینا محال ہے(116,122) نیز بقول ابن قیمؒ 123)) عمرؓ جیسے اصحاب فہم نے اس سے خال کا توریث مراد لیا ہے اور بعض نے جو اس سے سلطان مراد لیا ہے تو یہ خال کے مشہور معنی کو چھوڑ کر غیر مشہور اور غیر ظاہر معنی مراد لینا ہوگا جس کے لئے مستقل دلیل درکار ہوگی نیز رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مبارک کہ "الخال وارث من لا وارث لہ" کی حدیث شریف میں اگر خال سے مراد سلطان ہوتا تو یہ کہا جاتا" انا وارث من لا وارث لہ" (124) اور یہ جو ان کا استدلال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو حق دیا ہے تو ذوی لارحام کے حصص کی کتاب اللہ میں عدم موجودگی ان کی عدم توریث کی دلیل ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے عدم توریث کیسے ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ یہ تو سیاق و

ذوی الارحام کی عدم توریث کیونکہ صرف کتاب اللہ میں حق کی موجودگی کو ہی اگر حق کا دینا مانا جائے اور باقی نہیں تو دادی کا حصہ کتاب اللہ سے ثابت نہیں جس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے یہ الفاظ مبارکہ کہ " میں نہ تو کتاب اللہ میں اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں آپ کا حصہ پاتا ہوں " شاہد ہیں کیونکہ بعد میں سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق اس کا جب حصہ ثابت ہو گیا تو اس کو ذی فرض مانا گیا اس طرح ذوی الارحام کا حصہ گو کہ کتاب اللہ سے ثابت نہیں لیکن دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ اور اس حدیث کے بارے میں جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ خالہ اور پھوپھی کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے کے بارے میں علمائے احادیث کے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے(125) اور جن طرق سے مروی ہے وہ حجیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے(126) اور معیار حجت مان بھی لیا جائے تو اس کی تاویل کی جاسکتی ہے کہ اس سے یہ مراد لیا جاسکتا ہے کہ یہ ذوی الفروض اور عصبات میں نہیں۔

آخر میں عقلی دلیل کے طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذوی الارحام کو دو وجوہات سے حصہ مل سکتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور دوسرے یہ میت کے عرفی رشتہ دار بھی ہیں جبکہ بیت المال کے مسلمانوں کو صرف ایک وجہ سے حصہ مل سکتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور دو وجوہات کو ایک وجہ پر ترجیح کا حاصل ہونا ظاہر ہے۔

اس تمام بحث سے اگر نتیجہ نکلتا ہے کہ توریث ذوی الارحام ثابت ہے تو بھی ٹھیک اور اگر عدم قائلین کی بات پھر بھی سنی جائے تب بھی ان کے متاخرین نے چونکہ بیت المال کے غیر منتظم ہونے کے پیش نظر ذوی الارحام کے حق میں فتویٰ دے دیا ہے اس لئے اب یہ بحث خود بخود ختم ہو گئی۔ علمی اعتبار سے البتہ تمام دلائل میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ذوی الارحام کی توریث کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں اور جو اس کے قائل نہیں ان کے اقوال کی تاویل آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔

## ذوی الارحام میں تقسیم

جو حضرات ذوی الارحام کو باقی ترکہ دینے کے قائل ہیں ان میں دو طریقے قابل ذکر ہیں۔

طریقہ اہل قرابہ۔ اس پر امام ابو حنیفہؒ اور اس کے اصحاب کا عمل ہے۔(117) اور ایک قول امام احمد بن حنبلؒ کا بھی اس کے حق میں ہے(120)۔ صاحب کنز الدقائق اور اس کی شارح نے ذوی الارحام کے عصبات کے طرز پر چار اصناف بنائے گئے ہیں۔

1- میت کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبات میں نہیں مثلاً نواسا نواسی وغیرہ۔

2- میت کے وہ اصول جو ذوی لفروض اور عصبات نہیں اور جن کو اجداد رحمی اور جدات رحمی بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً نانا وغیرہ۔

3- میت کے ماں باپ کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبات نہ ہوں چاہے کتنی ہی نیچے ہو مثلاً بھانجی بھانجا وغیرہ اور پھر ان کی اولاد۔

4- میت کے دادا دادی کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبات نہ ہو چاہے کتنی ہی نیچے ہو مثلاً پھوپھی خالہ زاد وغیرہ۔

اس پر احناف میں اتفاق ہے کہ ورثاء میں اگر مختلف اصناف کے ذوی لارحام موجود ہوں تو ان میں حصہ صرف ان کو دیا جائے گا جن کا صنف کا نمبر سب سے کم ہے یعنی جو میت کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔

پھر ہر صنف میں بھی ترجیح ان کو ہو گی جو میت کے زیادہ قریب ہوں مثلاً پوتی کے بیٹے کے مقابلے میں نواسی زیادہ مستحق ہے گو کہ نواسی مؤنث اور پوتی کا بیٹا مذکر ہے۔ اس کو درجہ کہتے ہیں یعنی نواسی کی میت سے قرب دوسرے درجے کی ہے جبکہ پوتی کا بیٹے تیسرے درجے پر ہے۔

جہت قرابت رشتے کے واسطے پر منحصر ہے جبکہ قوۃ قرابت سے مراد رشتے کی قوۃ ہے جیسا کہ حقیقی بہن بھائی علاتی بہن بھائیوں سے زیادہ قوۃ قرابت والے ہیں۔

۔باقی تفصیلات صنف وار سراجی کے طریقے کے مطابق دی جاتی ہیں۔

## صنف اول میں تقسیم

1- اگر درجہ میں برابر ہوں لیکن قوۃ قرابت میں فرق مثلاً ان میں کچھ وارث یا وارثہ کی اولاد ہو اور کچھ نہیں تو وارث وارثہ کی اولاد غیر وارث کی اولاد کے مقابلے میں زیادہ مستحق ہیں مثلاً نواسی کا بیٹا پوتی کی بیٹی کے مقابلے میں محروم ہے گو کہ نواسی کا بیٹا مذکر اور پوتی کی بیٹی مؤنث اور درجہ میں برابر ہیں۔

2- اگر درجہ میں برابری ہو اور ان میں یا تو کوئی بھی وارث کی اولاد نہ ہو یا سب وارث کی اولاد ہو تو امام ابو یوسفؒ اور حسنؒ بن زیاد کے نزدیک تو مستحق ورثاء میں ذوی الارحام کے لئے مختص ترکہ للذکر مثل حظ الانثیین کے حساب سے تقسیم ہو گا چاہے ان کے اصول مذکر ہوں یا مؤنث جبکہ امام محمدؒ کے مطابق یہ اس وقت

ہوسکتا ہے جب ان کے اصول ایک جیسے ہوں۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر امام محمدؒ کے نزدیک اصول کا اعتبار کیا جائے گا اور وہ یوں کہ صفت تو اصول سے لی جائے گی اور عدد فروع سے۔اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ میت سے شروع کیا جائے گا اور جس بطن پر پہلی دفعہ ذکورت اور انوثت کا اختلاف پایا جائے تو وہیں دو طائفے بن جائیں گے جس میں مردوں کی طائفے میں حسب تعدادِ فروع، مردوں کی تعداد کو دگنا کیا جائے گا اور اس کو مردوں کے طائفے کا وزن سمجھیں گے۔اس طرح عورتوں کی تعداد کو عورتوں کی طائفے کا وزن سمجھیں گے۔ان دونوں اوزان کا مجموعہ بطن یا تقسیم شدہ طائفے کا کل وزن ہوگا۔عورتوں کی طائفے کا وزن کل وزن پر تقسیم کیا جائے گا تو عورتوں کا طائفے کی کسر معلوم ہو جائے گا۔اس طرح مردوں کے طائفے کا وزن کل وزن پر تقسیم کیا جائے گا تو یہ مردوں کی طائفے کا کسر قرار پائے گا۔اس کے بعد ہر طائفے کو ایک بطن پر محمول کرتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ ان کی اولاد میں ذکورت اور انوثت کا اختلاف آرہا ہے یا نہیں۔جہاں پھر پہلی دفعہ آئے گا تو اس کے ساتھ پہلا والا طریقہ دہرایا جائے گا یہاں تک کہ ورثاء تک بات پہنچ جائے۔اس میں یہ خیال رکھا جائے کہ اس ترتیب سے جتنے طائفے بنیں ہر ایک کو نمبر دیا جائے اور جب اس کی کسر معلوم ہو تو اس نمبر کے سامنے اس کو نوٹ کیا جائے۔ آخر میں جب یہ سب کچھ مکمل ہو جائے تو ہر وارث کو جس جس طائفے کے ذریعے میت کا ترکہ مل رہا ہے ان کے کسور کو آپس میں ضرب دی جائے تو یہی اس وارث کا حصّہ ہوگا۔

مثال: دو نواسی کے نواسے، ایک نواسی کی پوتی اور دو نواسے کی نواسیاں ہیں۔

ان میں سب چونکہ غیر وارث کے اولاد ہے اور سب درجے میں برابر ہیں اس لئے سب آپس میں شریک ہیں۔یہاں تک تو اتفاق ہے۔آگے امام ابو یوسفؒ اور حسنؒ بن زیاد کے نزدیک تو ان میں صرف ورثاء میں مردوں اور عورتوں کو دیکھا جائے گا اور ان میں ہر مرد کو ہر عورت سے دوچند حصّہ دیا جائے گا۔پس ان میں دو مرد ہیں اور تین عورتیں۔دو مردوں کے چار حصّے ہوئے اور تین عورتوں کے تین تو کل سات حصّے ہوئے جس میں ہر عورت کا حصّہ 1/7 اور ہر مرد کا حصّہ 2/7 آجائے گا۔امام محمدؒ کے نزدیک ان کا رشتہ پہلے پورا لکھنا پڑے گا جیسا کہ شکل میں ہے۔

پہلی بطن میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری میں ہے اس لئے اس میں دو طائفے بنے۔ نمبر 1 بیٹیوں اور نمبر 2 بیٹوں کا۔ چونکہ نواسی کے نواسے دو ہیں جن کی نمائندگی اس بطن میں دو بیٹیاں کر رہی ہیں اور نواسی کی پوتی ایک ہے جس کی نمائندگی ایک بیٹی کر رہی ہے پس اس طائفے میں کل تین عورتیں ہوئیں۔ طائفہ نمبر 2 میں 2 نواسے کی بیٹیوں کی نمائندگی دو بیٹے کر رہے ہیں اس لئے اس میں دو مرد ہوئے۔ ان کی تعداد کو 2 سے ضرب دے کر ان میں طائفہ نمبر 1 کے عورتوں کی تعداد جو کہ تین ہیں جمع کیں تو جواب 7 آیا جو کہ اس بطن کا کل وزن ہے۔ اس میں طائفہ نمبر 1 کی کسر 7/3 ہو گئی اور طائفہ نمبر 2 کی کسر 7/4 ہو گئی۔ اب بطن نمبر 3 پر طائفہ نمبر 1 دو مزید طائفوں نمبر 3 اور نمبر 4 میں تقسیم ہو گئی جس میں طائفہ نمبر 3 میں دو نواسی کے نواسوں کی نمائندگی دو بیٹیاں کریں گی جس سے اس کا وزن 2 ہو جائے گا اور نمبر 4 میں نواسی کی پوتی ایک بیٹا کر رہا ہے اس لئے اس کا وزن بھی 2 ہو جائے گا۔ پس طائفہ نمبر 1 کا کل وزن 4 ہو جائے گا جس سے طائفہ نمبر 3 کی کسر 4/2 اور طائفہ نمبر 4 کی کسر بھی 4/2 ہو جائے گی۔ طائفہ نمبر 2 سے کوئی طائفہ نہیں بن رہا کیونکہ اگلی بطن پر اس میں کوئی ذکورت انوثت کا اختلاف نہیں۔ نہ ہی طائفہ نمبر 3 اور طائفہ نمبر 4 میں اگلی بطن پر اسی وجہ سے کوئی اور طائفہ وجود میں آرہا ہے۔ اب آخر میں ہم دیکھتے ہیں تو نواسی کے نواسے کو طائفہ نمبر 3 اور طائفہ نمبر 1 کے ذریعے حصّہ مل رہا ہے پس ان کی کسور کا حاصل ضرب اس میں جتنے افراد ہیں کا حصّہ ہو گا سو وہ 4/2 * 7/3 = 28/6 ہوا۔ چونکہ اس میں دو افراد ہیں اس لئے ہر فرد کا حصّہ 28/3 آیا۔

نواسی کی پوتی کو طائفہ نمبر 4 اور طائفہ نمبر 1 کے ذریعے حصّہ مل رہا ہے پس اس کا حصّہ ان کی کسور کا حاصل ضرب 4/2 * 7/3 = 28/6 ہوا۔ نواسے کی نواسیوں کو طائفہ نمبر 1 سے ہی حصّہ مل رہا ہے جو کہ 7/4 ہے پس یہی اس کے دو افراد میں تقسیم ہو گا اس لئے نواسے کی نواسی کا حصّہ 7/2 آجائے گا۔

## دوسری صنف میں تقسیم

سب سے کم درجہ والے اجداد اور جدات رحمی آپس میں شریک ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ درجہ والے سب محروم۔ ان کا طریقہ صنف اول کی طرح ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ اور وہ یہ کہ ان میں مردوں کے طائفے میں مردوں کی تعداد جتنی بھی اس کی کسر 3/2 اور عورتوں کی طائفے میں عورتوں کی تعداد جتنی بھی

ہو اس کی کسر 1/3 ہوتی ہے۔ بعض کتابوں میں سراجیہ کی عبارت کا مطلب صحیح نہیں لیا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے اس کو بالکل صنف اول کی طرح سمجھا گیا اور اس غلطی کی وجہ شاید " وان اختلفت صفة من یدلون بھم یقسم المال علیٰ اول بطن اختلف کمافی الصنف الاول" میں "کمافی الصنف الاول" کے الفاظ ہیں حالانکہ غور کیا جائے تو اس لفظ کا اطلاق صرف اس پر ہو رہا ہے کہ جب اصول میں اختلاف ہو پھر پہلی بطن جس میں اختلاف ہو تو طائفے بنیں گے اور ان میں مال تقسیم ہو گا جیسا کہ صنف اول میں ہوتا ہے۔ ورنہ پھر اگلی سطر کے کیا معنی لئے جائیں گے۔ " وان ختلفت قرابتھم فالثلثان لقرابۃ الاب و ھو نصیب الاب و الثلث لقرابۃ الام و ھو نصیب الام ثم ما اصاب لکل فریق یقسم بینھم کمالو اتحدت قرابتھم " اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب قرابت ایک جیسی ہو تو کسی طائفے میں مردوں کی تعداد جتنی بھی ہوں ان سب کو دو ثلث دیا جائے گا جو کہ باپ کا حصّہ ہے اور کسی طائفے میں عورتوں کی تعداد جتنی بھی ہو ان سب کو ایک ثلث دیا جائے گا کیونکہ یہ فرض کیا جائے گا کہ گویا ہر دو طائفوں میں ایک طائفہ باپ کا ہے اور دوسرا طائفہ ماں کا ہے کیونکہ کسی کی ماں اور باپ ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے اور شاید یہی اس کی وجہ ہے کیونکہ اولاد تک ایک شخص کی کئی ہوسکتی ہے لیکن ماں باپ ایک سے زیادہ نہیں ہوتے۔ صنف رابع میں مندرجہ بالا عبارت آئی ہے لیکن وہاں اس کا یہی مطلب لیا جاتا ہے جو ہم یہاں لیتے ہیں اس لئے اس کا یہی مطلب مناسب ہے۔ واللہ اعلم

## تیسری صنف میں تقسیم

صنف اول کی طرح ان میں صرف وہی حقدار ہوں گے جن کا درجہ سب سے کم ہو گا۔ درجہ کی برابری کی صورت میں عصبہ کی اولاد کو ذورحم کے اولاد پر ترجیح دی جائے گی مثلاً بھتیجے کی بیٹی اور بھانجی کے بیٹے میں بھتیجے کی بیٹی کو مؤخر الذکر پر فوقیت حاصل ہے۔

اگر درجہ میں برابری تو اگر ان میں کوئی ولد عصبہ نہیں ہو یا سارے عصبہ کی اولاد ہو یا ذوی الفروض کی تو امام ابویوسفؒ کے نزدیک قوی ترین مستحق ہو گا اور باقی محروم ہوں گے لیکن امام محمدؒ فروع (موجود ورثاء) کی تعداد کے مطابق ان کے اصول ( میت کے بہن بھائی) کو زندہ مان کر پہلے ترکہ ان میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر ہر اصل کا حصّہ ان کی اولاد میں بطریقہ صنف اول تقسیم کرتے ہیں۔

اگر مستحق ورثاء میں سارے مرد یاساری عورتیں ہوں تومال ان میں برابر تقسیم ہوگا نہیں ہو توللذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق۔

مثال: تین حقیقی بھتیجیاں، دو حقیقی بھانجے، دو حقیقی بھانجیوں، ایک اخیافی بھانجا اور ایک اخیافی بھتیجا ہیں۔ امام ابویوسفؒ کے طریقے کے مطابق چونکہ سب کا درجہ برابر اور جہت قرابت بھی ایک ہے لیکن حقیقی بھتیجیاں اور حقیقی بھانجے اور بھانجیاں قوت میں باقی سب سے زیادہ ہیں اس لئے اخیافی بھانجے بھتیجے محروم رہیں گے۔ پھر تین بھتیجیوں، دو بھانجوں اور دو بھانجیوں میں کل پانچ عورتیں اور دو مرد ہوئے جو نو عورتوں کے برابر ہوئے پس ہر عورت کو 1/9 حصّہ ملے گا اور ہر مرد کو 2/9۔

امام محمدؒ کے مطابق یہ سمجھا جائے گا کہ اپنے اپنے اولاد کی تعداد کے مطابق تین حقیقی بھائی، چار حقیقی بہنیں اور دو اخیافی بہن بھائی زندہ ہیں۔ پہلے ان میں تقسیم ہوگا تو تین حقیقی بھائیوں کو 10/4، چار حقیقی بہنوں کو 15/4 اور دو اخیافی بہن بھائیوں کو 1/3 ملے گا۔ اس میں ہر حقیقی بھتیجی کو حقیقی بھائیوں کا حصّہ تقسیم ہو کر 15/2 ملے گا۔ چار حقیقی بہنوں کا حصّہ 15/4 دو حقیقی بھانجوں اور دو حقیقی بھانجیوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم ہوگا تو ہر حقیقی بھانجے کا حصّہ 45/4 اور ہر حقیقی بھانجی کا حصّہ 45/2 بنے گا۔ اس طرح اخیافیوں کا ثلث ان کی اولاد میں برابر تقسیم ہو کر ہر اخیافی بھانجے اور اخیافی بھتیجے کا حصّہ 6/1 بنے گا۔

## چوتھی صنف میں تقسیم

ان میں اگر کوئی اکیلا وارث ہو تو ذوی الارحام کا سارا مال اس کا ہوگا۔

اگر کئی ہوں تو سب سے پہلے جہت قرابت کو دیکھا جائے اگر جہت قرابت ایک ہو تو ٹھیک ورنہ ماں کی طرف کے ورثاء (جتنے بھی ہوں) سب کو ایک ثلث دیا جائے اور باپ کی طرف کے ورثاء (جتنے بھی ہوں) سب کو دو ثلث دیئے جائیں گے۔

جن کی جہت قرابت ایک ہو ان میں پھر قوت قرابت کا لحاظ ہوگا۔ پس حقیقی پھوپھی علاتی پھوپھی سے اور وہ اخیافی پھوپھی سے اولیٰ ہوں گی۔ اس طرح ماں کی طرف میں حقیقی علاتیوں سے اور وہ اخیافیوں سے اولیٰ ہوں گے۔

# صنف رابع کے اولاد میں تقسیم

1- جن کا درجہ سب سے کم ہو گا ان میں مستحق ہوں گے باقی محروم ہوں گے۔

ان میں اگر کوئی اکیلا وارث ہو تو ذوی الارحام کا سارا مال اس کا ہو گا۔

اگر کئی ہوں تو سب سے پہلے جہت قرابت کو دیکھا جائے اگر جہت قرابت ایک ہو تو ٹھیک ورنہ ماں کی طرف کے ورثاء (جتنے بھی ہوں) سب کو ایک ثلث دیا جائے اور باپ کی طرف کے ورثاء (جتنے بھی ہوں) سب کو دو ثلث دیئے جائیں گے۔

یکساں درجے کی ورثاء میں جن کی جہت قرابت ایک ہو اور وہ سب یا تو ولد وارث نہ ہوں یا سب ولد وارث ہوں تو ان میں پھر قوت قرابت کا لحاظ ہو گا پس جن کی قوت قرابت زیادہ ہو گی وہی مستحق ہو گا پس حقیقی علاتیوں کے مقابلے میں اور علاتی اخیافیوں کے مقابلے میں اولیٰ ہوں گے۔

یکساں درجے کی ورثاء میں جن کی جہت قرابت ایک ہو اور قوت قرابت میں سب برابر ہوں تو ولد عصبہ اولیٰ بالمیراث ہو گا مثلاً چچا کی بیٹی اور پھوپھی کا بیٹا حقیقی یا علاتی ان میں چچا کی بیٹی مستحق ہے۔

یکساں درجے کی ورثاء میں جن کی جہت قرابت ایک ہو کوئی ولد وارث ہوں اور کوئی نہ ہوں تو ان میں بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق قوت قرابت کا لحاظ ہو گا پس جن کی قوت قرابت زیادہ ہو گی وہی مستحق ہو گا پس حقیقی علاتیوں کے مقابلے میں اور علاتی اخیافیوں کے مقابلے میں اولیٰ ہوں گے دلیل یہ ہے کہ علاتی خالہ گو ولد ذو رحم ہے اور اخیافی خالہ ولد وارثہ ہے لیکن علاتی خالہ بالاجماع اخیافی خالہ سے اولیٰ ہے کیونکہ قوت قرابت خود وارث میں نہیں بلکہ اس کی غیر یعنی اس کی ماں میں ہے اس لئے قوت قرابت پر فیصلہ ہونا چاہیئے لیکن بعض شارحین نے ولد عصبہ کے اولیٰ ہونے کا قانون زیادہ عام مانا ہے اس لئے ان کے نزدیک علاتی چچازاد بہن حقیقی پھوپی زاد کے مقابلے میں اولیٰ ہے جبکہ ظاہر الروایۃ کی رائے میں حقیقی پھوپھی زاد کو علاتی چچازاد بہن پر ترجیح دی جائے گی۔

احقر کی رائے میں شارحین کی رائے میں قوت ہے کیونکہ اگر ان کے مدلیٰ بہ موجود ہوتے تو علاتی چچا حصّہ پاتے اور حقیقی پھوپھی محروم ہو جاتی پس چونکہ ذوی الارحام عصبات ثانوی ہیں تو ان عصبات کی اولاد میں

کا علاتی خالہ کے مقابلے میں محروم ہونا ہے تو اخیافی خالہ گو کہ ولد وارثہ ہے یعنی نانی کی بیٹیہے لیکن اخیافی خالہ اور علاتی خالہ کو ان کی ماں یا باپ کی وساطت سے حصّہ نہیں مل رہا ہے بلکہ میت کے ماں ساتھ تعلق کے بنیاد پر حصّہ مل رہا ہے جس میں قوت قرابت کے لحاظ سے علاتی کو اخیافی پر فوقیت حاصل ہے۔

مختصراً صنف رابع کے ورثاء میں سب سے پہلیا گر ماں باپ دونوں جانب کے رشتہ دار موجود ہوں تو ماں کے رشتہ داروں کو ثلث اور باپ کے رشتہ داروں کو دو ثلث دلوایا جائے گا۔ پھر دونوں طرف کے حصّوں کو صاحبین کے مسلک پر سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ کے طریقے پر پہلے صنف ثالث کی طرح ان کی بہن بھائیوں میں جو مستحق ترین ہوں ان کو حصّہ دیا جائے گا۔ پھر ان میں ہر ایک کا محسوبہ حصّہ ان کی پہلے درجے کی اولاد میں تو اگر صرف مرد ہوں یا عورتیں تو برابر ورنہ للذکر مثل حظ الانثیین کے طریقے پر تقسیم ہوتا ہے اور اگر ایک سے زیادہ درجے کی اولاد ہو تو پھر ان میں صنف اول کے طریقے پر تقسیم کیا جائے گا۔

## صاحبین - کے طریقوں کا خلاصہ

امام ابو یوسفؒ اور حضرت حسن بن زیادؒ سارے اصناف میں ترجیح وراجح پر عمل کرنے کے بعد ترکہ کو قوی ترین مستحق ورثاء میں اگر سب مرد ہوں یا سب عورتیں تو برابر برابر تقسیم کرتے ہیں لیکن اگر ان میں مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو پھر ان میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم کرتے ہیں۔ امام محمدؒ کا طریقہ شمس الائمہ علامہ سرخیؒ کے مطابق امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب اشہر الروایتین میں سے ہے اور ساتھ ہی بلاشبہ یہ ریاضی کا شاہکار بھی ہے اور اس پر بمطابق سراجی فتویٰ بھی اس میں پہلی صنف میں وصف اصول سے اور عدد فروع سے لیتے ہیں دوسری صنف میں صرف وصف اصول سے لیتے ہیں اور باپ کے طائفے کو دو ثلث اور ماں کی طائفے کو ایک ثلث دلواتے ہیں، تیسرے صنف میں فروع کے اصول کو زندہ مان کر پہلے ان میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر ہر اصل کا حصّہ اس کی فروع میں بطریق صنف اول تقسیم کرتے ہیں نیز ان میں اخیافیوں کو برابر برابر دلواتے ہیں اور صنف چہارم میں پہلے ماں باپ کے رشتہ داروں میں ایک ثلث اور دو ثلث کے حساب سے تقسیم کرنے کے بعد امام ابو یوسفؒ کے طریقے پہلے ماں باپ کے بھائیوں بہنوں میں مال تقسیم کرتے ہیں اور پھر ان میں ہر ایک کے حصّہ میں ذوی الفروض اولاد میں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق تقسیم کرتے ہیں اور ذوی الارحام اولاد میں اپنے صنف اول کے طریقے پر تقسیم کرتے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے طریقوں میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ اصول کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ فروع کی تعداد پر ہی فیصلہ کرتے ہیں جبکہ امام محمدؒ عدد فروع سے لیتے ہیں اور وصف اصول سے۔ حضرت امام محمدؒ کے طریقے کی پیروی کرنے والے حضرات نے جو دلائل تحریر فرمائے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل یہ تین دلائل ہیں۔

-1 صحابہؓ اس پر متفق ہیں کہ عمۃ اور خالۃ میں عمۃ کو جہت اب کے دو ثلث اور خالۃ کو جہت ام کا ایک ثلث دیا جائے گا۔ اس سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اصول پر نظر رکھنی چاہیئے اور پہلے اختلاف میں ان میں لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْن کے مطابق تقسیم ہو گیا۔ پس اس سے اصول کے وصف کے مطابق ترکہ میں حصّے کا تبدیل ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

-2 فقہاء میں اس بات پر اجماع ہے کہ جو ورثاء کسی وارث کے ذریعے میت سے حصّہ لیتے ہیں وہ اولیٰ ہوتے ہیں۔ اس میں بھی اصول پر نظر ہے نہ کہ فروع پر۔

-3 اصل پر نظر ڈالنے کے باعث فروع ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو اصل کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی پس جتنے فروع ہوں گے اتنی علتیں ہوں گی۔ اس لئے عدد فروع سے لینا بھی ثابت ہو گیا پس:

ان تین ادلہ میں اصحاب امام محمدؒ نے آپؒ کا طریقہ بہت اچھی طرح ثابت کیا۔

یہ طریقہ کافی لمبا اور مشکل ہے اس وجہ سے میراث کا علم رکھنے والوں میں بھی بہت کم ایسے ہیں جو اس کے مطابق سوال حل کرسکتے ہوں اگرچہ راقم نے اس کے لئے کمپیوٹر پروگرام تیار کیا ہے جس کی مدد سے اب امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے ہر دو مسلکوں پر مسئلہ حل کرنا کوئی مشکل نہیں رہا لیکن اگر کوئی اس کی اپنے طور پر تحقیق کرنا چاہے تو ان کو پھر مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا الا کہ کسی پر اعتماد کریں۔ اکثر علماء بخارا نے رفع صعوبت کے خاطر قول امام ابو یوسفؒ پر فتوٰی دیا شیخ اسیجابی نے مبسوط میں اس کی تصحیح کی ہے اور بمطابق "احکام الترکات والمواریث" علامہ سرخسیؒ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح بتایا ہے۔ علمائے خوارزم نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔ نیز ماتن نے امام محمدؒ کے قول کو اشہر الروایتین فرمایا ہے اس لئے امام ابو یوسفؒ کا قول شاذ نہیں بلکہ دو مشہور اقوال میں کم مشہور قول ہے۔ حال ہی میں بعض عرب ممالک میں احناف نے بھی مشائخ بخارا کی تقلید

میں امام ابو یوسفؒ کے طریقے پر فتوے دینے شروع کئے ہیں اس لئے اگر یہاں بھی اس قول کے مطابق فتویٰ دینے کی گنجائش ہو تو اس سے استفادہ کی کوئی صورت نکل آسکے کیونکہ ہر طرف احناف کے اکابر آئمہ ہیں۔

امام ابو یوسفؒ کا قول واضح کرنے کے ان دلائل کا ذکر ضروری ہے جو امام ابو یوسفؒ کے قول کے حق میں دیئے جاتے ہیں۔

1۔ امام ابو یوسفؒ قاضی تھے اور قاضی معاملات کے مسئلوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

2۔ احناف کے نزدیک ذوی الارحام میں تقسیم عصبات کی تابع ہوتی ہے کیونکہ ذوی الارحام ایک لحاظ سے عصبات حکمی ہیں یعنی جب یہ مردوں کی وساطت سے ہوں تو حقیقی عصبات اور اناث درمیان میں ہوں تو حکمی عصبات۔ اس کی تائید حضرت علیؓ کے اس فیصلے سے ہو جاتی ہے جس میں ایک نواسی اور ایک بھانجی میں حضرتؓ نے سارا مال نواسی کو دیا جس میں حضرت نے نواسی اور بھانجی میں ترکہ کو نصف نصف بانٹا تھا پس جیسے عصبات میں سب سے پہلے اولاد میں الاقرب فالاقرب پر عمل ہوتا ہے پھر آباء واجداد پھر اخوہ کی اولاد میں پھر باپ کے بھائیوں اور ان کی اولاد پھر دادا کے بھائیوں اور ان کی اولاد میں وغیرہ وغیرہ تو ایسا ہی احناف کے ہاں ذوی الارحام کے بھی چار اصناف میں اقرب صنف کے ورثاء میں الاقرب فالاقرب پر عمل ہونا چاہیے کیونکہ ذوی الارحام میں اصناف کی ترتیب بھی بعینہ یہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں عورتیں بھی حصہ پاتی ہیں پس برابر کے مستحق یا برابر کے قرب والوں کے مردوں اور عورتوں کے گروپ بن سکتے ہیں پس اعلیٰ گروپ کے ورثاء کے مقابلے میں ادنیٰ گروپ والے ورثا محروم ہونے چاہئیں جیسا کہ حقیقی بہن بھائیوں کے بیٹیاں بیٹے ایک گروپ ہے تو علاتی بہن بھائیوں کے بیٹے بیٹیاں دوسرا گروپ پس حقیقی بہن بھائیوں کی اولاد اسی طرح علاتی بہن بھائیوں پر فوقیت رکھتی ہے جیسا کہ عصبات میں حقیقی بہن بھائی علاتی بہن بھائیوں پر فوقیت رکھتے ہیں اور حقیقی بہن بھائی جب موجود ہوں تو علاتی بہن بھائیوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہاں اگر حقیقی بہن کو ذوی الفروض میں حصّہ ملا تو علاتی بہن بھائیوں کی عصبات میں باری آسکتی ہے لیکن عصبات کے اندر اگر ان کا آپس میں مقابلہ ہو تو علاتیؒ بہن بھائی بالکل محروم ہوں گے۔ احناف میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ کا نہ صرف اس پر صنف میں جیسا کہ بتایا گیا ہے عمل ہے بلکہ اقرب صنف کے ورثاء میں بھی الاقرب فالاقرب پر عمل ہے جبکہ حضرت امام محمدؒ کا صنف میں تو اس پر عمل ہے لیکن صنف ثالث کے ورثاء میں پھر الاقرب فالاقرب پر عمل نہیں بلکہ

جن ذوی الفروض اور عصبات کے ذریعے یہ میت کے رشتہ دار ہیں ان پر ان کو قیاس کر کے پہلے ذوی الفروض اور عصبات کے قاعدے پر ان کو حصّہ دلواتے ہیں پھر ان ذوی الفروض اور عصبات کا حصّہ ان میں بطریق صنف اول بانٹتے ہیں پس اگر صرف حقیقی بہن کی اولاد ہو اور ساتھ علاتی بہن بھائیوں کی اولاد بھی ہو تو امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ کے مسلک پر تو حقیقی بہن کی اولاد مستحق ٹھہرے گی جبکہ ان کے مقابلے میں علاتی بہن بھائیوں کی اولاد یکسر محروم ٹھہرے گی۔ امام محمدؒ کے طریقے میں حقیقی بہن کی اولاد کو اتنی بہنیں جتنی ان کی اولاد ہے فرض کیا جائے اور علاتی بہن بھائیوں کی اولاد کو بھی اتنے بہن بھائی فرض کیا جائے گا جتنی جتنی ان کی اولاد ہے پھر دیکھا جائے گا کہ ہر بہن کو کتنا حصّہ ملتا ہے اور ہر علاتی بہن یا بھائی کو۔ ان کا حصّہ پھر ان کی اپنی اپنی اولاد میں بطریق صنف اول تقسیم کیا جائے گا۔ اس تمام تفصیل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ کا طریقہ ذوی الارحام کے اصل تعریف کے زیادہ قریب ہے۔

-3 جیسا کہ ذوی الفروض میں اللہ میاں نے مردوں کو عورتوں پر فوقیت دی ہے جب وہ موجود ہوں اور اگر ان میں سے کوئی میت سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسی کے حصہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور مردوں کی عورتوں پر یہ فوقیت ان کی زندگی کی ضروریات کے حساب سے بتائی جاتی ہے تو ذوی الارحام میں بھی فیصلہ زندوں کی ضروریات کے مطابق للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدے سے ہونا چاہیے نہ کہ ان کے مدلیٰ بہ رشتہ دارں کے حصص کے مطابق اور یہی طریقہ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ کا ہے کہ اس میں فیصلہ فروع کی تعداد اور مرد و عورت کے حساب سے ہوتا ہے۔

امام محمدؒ کے طریقہ چونکہ وصف اصول سے اور عدد فروع سے لینے کا ہے، اس کے حق میں تین دلائل کا جواب وہ یوں دیتے ہیں کہ عمۃ اور خالۃ میں جو دو ثلث اور ایک ثلث کی تقسیم ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ یہ اصول ہیں اور ان پر نظر ہے بلکہ یہ تو اختلاف جہت کی طرف لے جانے والی جو اختلاف سبب کا باعث ہے۔ جب سبب مختلف ہو تو استحقاق بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ اور استحقاق جب یکساں ہو تو اس میں پھر اصول کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس باپ کے سبب سے حصّہ لینے والوں کو دو ثلث اور ماں کے سبب سے حصّہ لینے والوں کو ایک ثلث دیا جاتا ہے۔ اس پر امام ابو یوسفؒ کے ہاں بھی عمل ہے اس لئے قول صحابہ جہاں تک تھا اتنا تو امام ابو یوسفؒ

ملاحظہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح میں ولد وارث کا اولیٰ ہونے میں بھی اختلاف نہیں بلکہ یہ تو عصبات کے قانون کے عین مطابق ہے جس پر ذوی الارحام کا دارو مدار ہے لیکن اس سے اصل پر نظر کو ثابت کرنا پھر ظنی ہے جس پر عمل کرنے میں مزید دلائل آڑے آرہے ہیں اور وہ یہ کہ یہ تو نسب کی قوت کے مؤثر ہونے پر دلالت کررہا ہے جس کو قوت قرابت بھی کہتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔اس طرح عدد کو فروع سے لیناوہاں بھی اس استعمال ہو جاتا ہے جہاں خود فروع پر تقسیم کیا جانا ہو بلکہ زیادہ بہتر صورت میں۔

4-اخیافی بھائیوں میں ذوی الفروض میں مرد و عورت کا فرق نہیں کیا جاتا اور یہ استثناء ہے عام قانون سے جو تقریباً تمام ذوی الفروض ورثاء کے لئے لاگو ہے بذریعہ نص۔ نص کے ذریعے جب کسی عام قانون سے استثناء ہو تو اس استثناء کو عام نہیں کیا جاتا بلکہ کسی دوسری جگہ صرف

اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب حالات بالکل ایک جیسے ہوں اور یہاں ایک جگہ ذوی الفروض ہیں اور دوسری جگہ ذوی الارحام اس لئے اخیافیوں کی اولاد میں بھی عام قاعدے کے مطابق للذکر مثل حظ الانثیین کا قاعدہ جاری کرنا چاہیے نہ کہ استثنائی طریقہ اور یہی فیصلہ اس مسئلے میں امام ابو یوسفؒ کا ہے نیز ان کا قانون صنف سوم وچہارم کے لئے ایک ہی ہے اور امام محمدؒ کے ہاں صنف سوم کا قانون اخیافیوں کے برابری کا ہے جبکہ صنف چہارم میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ کا ہے

5۔ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیاد کا قانون بہت ہی سادہ اور آسان ہے اس لئے ﴿يَسِّرِ وَاوَلَا تُعَسِّرِ وَا﴾ پر عمل کرتے ہوئے اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور آجکل کے دور میں شاید اسکی ضرورت بھی ہے کیونکہ امام محمدؒ کا طریقہ مشکل ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اس لئے علم میراث کو پڑھانے والے بھی اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے اس لئے بعض اہل فتویٰ بھی ذوی الارحام میں میراث کی تقسیم کو نہیں جانتے لیکن امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ کا طریقہ چونکہ زیادہ عام فہم ہے اس لئے اگر اس پر آج کل فتویٰ دینے کی گنجائش ہو تو ذوی الارحام کا علم عملاً زندہ ہو سکتا ہے اور اس کی آسانی کے ساتھ مذکورہ بالا حقائق بھی مد نظر رکھے جائیں تو شاید یہ فیصلہ اور بھی آسان ہو جائے۔ واللہ اعلم

شاید یہی وجہ ہے کہ شام اور مصر وغیرہ میں اب احناف اس پر فتویٰ دینے لگے ہیں حالانکہ عام فتویٰ حضرت امام محمدؒ کے قول پر ہے جیسا کہ السراجی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

## 2- طریقہ اہل تنزیل

اس پر امام احمد بن حنبلؒ اور شوافع اور مالکیہ کے متاخرین کا عمل ہے۔ اس میں ذوی الارحام کو ذوی الفروض اور عصبات دونوں کا تابع کیا اگر جاتا ہے اس میں جس کا جس ذی فرض یا عصبہ کے ذریعے میت کے ساتھ رشتہ بنتا ہے اس کو ان کی غیر موجودگی میں وہی فرض کیا جاتا ہے جیسے کہ

وہ خود موجود ہو اور پھر مسئلہ کو معمول کے مطابق حل کیا جاتا ہے۔ پس:

-بیٹیوں کی اولاد کو بیٹیاں

2-پوتی کی اولاد کو پوتیاں

3-پڑپوتی کی اولاد کو پڑپوتیاں

4-سکڑپوتی کی اولاد کو سکڑپوتیاں

5-باپ کے اخیافی بہن بھائیوں کو باپ

6-ماں کے ہر قسم کے بھائی بہنوں، والد کے اور اس کے اصول کو ماں

7- حقیقی بہن کی اولاد کو حقیقی بہنیں

8-علاتی بہن کی اولاد کو علاتی بہنیں

9اخیافی بہن بھائیون کی اولاد کو اخیافی بھائی

10- قریبی حقیقی دادا کے اخیافی بہن بھائیوں کی قریبی دادا

11-باپ کی ہر قسم کی خالاؤں، نانا اور اس کے اصول کو دادیاں

12-ماں کے ہر قسم کے ماموں، خالاؤں، نانا اور اس کے اصول کو نانیاں

13- حقیقی بھائی کی اولاد کو حقیقی بھائی

14-علاتی بھائیوں کی اولاد کو علاتی بھائی

15-اخیافی بھائیوں کی اولاد کو اخیافی بھائی

16- عصبات کی اولاد کو وہی عصبات جن کی وہ اولاد ہے سمجھا جائے گا۔ ان میں پھر تین جہات مقرر کی گئیں جن میں ہر جہت کے اندر جو ورثاء موجود ہیں ان میں قریبی بعید کو محروم کر دیتے ہیں۔ وہ جہات درج ذیل ہیں۔

1- جہات ابوی۔ اس میں نمبر 5، 13، 10، 8، 7 اور 14 شامل ہیں۔

2- جہات اموی۔ اس میں نمبر 6، 12، 9 اور 15 شامل ہیں۔

3- جہات بنوی۔ اس میں نمبر 1 سے لے کر نمبر 4 تک شامل ہیں۔

اگر ان تین جہتوں میں کوئی موجود نہ ہو تو پھر لا محالہ عصبات کی اولاد کو باقی سارا مال ملے گا۔ عصبات کی اولاد میں قریب بعید کو محروم کرے گا جیسا کہ عصبات میں قریبی بعید کو محروم کرتا ہے نیز اس عصبہ کی اولاد مقدم ہے باقی سب پر جو میت سے رشتے میں زیادہ قریب ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان عصبات کے کوڈوں میں جن کی اولاد موجود ہو دیکھا جائے گا کہ کس کا کوڈ نمبر کم ہے جس کا بھی کم ہو گا اسی کی اولاد کو باقی سارا مال دیا جائے گا۔ عصبات کے کوڈ کے لئے ایک دفعہ پھر مؤلف کی کتاب فہم المیراث کے عصبات کا شجرہ نادب دیکھنے کی ضرورت پڑے گی۔

## اہل تشیع کے نزدیک میراث کی تقسیم

اہل تشیع کے ہاں میراث کا طریقہ کافی مختلف ہے جس کا تعلق دلائل سے کم اور سیاست سے زیادہ ہے تاہم اس کو زیر بحث لانے سے پہلے یہ بات سمجھنی پڑے گی کہ اہل تشیع کا اہل سنت کے ساتھ اصولی اختلاف ہے فروعی نہیں اس لئے ان کے طریقے کو ثابت اہل سنت کے اصولوں سے کرنے کی کوشش فضول ہو گی۔ اہل سنت قرآن حدیث اجماع اور قیاس مجتہد کے قائل ہیں یعنی کسی مسئلے کو ثابت کرنے کے یہ چار مآخذ ہیں جبکہ اہل تشیع کے ہاں اجماع نہیں اور سنت کی تشریح میں بھی بہت واضح اختلاف ہے۔ وہ یوں کہ ان کے نزدیک حدیث کا کسی اہل بیت سے مروی ہونا ضروری ہے اور اس پر فیصلہ اگر امام معصوم سے ہو تو وہ قطعی فیصلہ ہے بصورت دیگر پھر عقل سے کام لیا جائے گا۔ اس تناظر میں اگر اہل تشیع کا طریقہ اہل سنت سے بالکل مختلف نظر آئے تو اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہو گی۔

اہل سنت کے نزدیک ورثاء کی تین قسمیں ہیں۔ذوی الفروض،عصبات اور ذوی الارحام۔ان میں ذوی الفروض کا اگرچہ پہلا نمبر ہے لیکن عصبات ان کی موجودگی میں حصّہ پاسکتے ہیں بشرطیکہ ترکہ میں کچھ باقی ہو۔اہل تشیع کے نزدیک بھی ورثاء تین اصناف میں منقسم ہیں۔

1۔ ماں باپ اور میت کی اولاد چاہے کتنی ہی نیچے درجے کی ہو۔

2۔ میت کے اجداد و جدات کتنے ہی اوپر درجے کے ہوں اور میت کے بہن بھائی کسی بھی قسم کے ہوں اور ان کی اولاد چاہے کتنی ہی نیچے درجے کی ہو۔

3۔الف۔میت کے تمام قسم کے چچا اور پھوپھیاں،ماموں اور خالائیں۔

ب۔ان کی اولاد چاہے کتنی ہی نیچے درجے کی ہو قریبی درجے والے دور کو محروم کریں گے

ج۔میت کے والدین کے تمام قسم کے چچا،پھوپھیاں،ماموں اور خالائیں

د۔ان کی اولاد چاہے کتنی ہی نیچے درجے کی ہو قریبی درجے والے دور کو محروم کریں گے

ہ۔ میت کے اجداد اور جدات جس قسم کے ہوں اور جتنے ہی اوپر ہوں ان کے تمام قسم کے چچا ،پھوپھیاں،ماموں اور خالائیں۔قریبی درجے والے دور کو محروم کریں گے۔

و۔ان کی اولاد چاہے کتنی ہی نیچے درجے کی ہو قریبی درجے والے دور کو محروم کریں گے۔

ایک وقت میں صرف ایک صنف والے ہی حصّہ پاسکتے ہیں جو وہ ہوگا جس کا نمبر سب سے کم ہوگا۔پہلے دو اصناف میں ذوی الفروض اور عصبات بیک وقت حصّہ پاسکتے ہیں لیکن آخری میں نہیں۔اس میں صرف عصبات ہی ہیں۔شیعہ مسلک میں ذوی الارحام نام کی کوئی چیز نہیں۔مجموعی طور پر اہل سنت کے ساتھ میراث میں مندرجہ ذیل فرق نوٹ کئے گئے ہیں۔

1۔شیعہ مسلک میں بیٹی کی اولاد بھی بطریق قائمقامی کے ذوی الفروض اور عصبات بن سکتے ہیں جبکہ اہل سنت کے ہاں بیٹی کی اولاد صرف ذوی الارحام میں حصّہ مل سکتا ہے اور یہ تب ممکن ہے کہ ذوی الفروض نسبی اور عصبات میں کوئی بھی نہ ہو۔

2۔اہل تشیع کے نزدیک اخوہ کی تعریف درج ذیل ہے۔

الف۔دو بھائی ہوں حقیقی یا علاتی مختلف ہوں یا ایک جیسے۔

ب۔ایک بھائی اور دو بہنیں ہوں حقیقی یا علاتی مختلف ہوں یا ایک جیسے۔

ج۔چار بہنیں ہوں حقیقی یا علاتی مختلف ہوں یا ایک جیسے۔

3۔شیعہ مسلک میں پوتی، پڑپوتی اور سکڑپوتی وغیرہ ذوی الفروض کے جدول میں جگہ نہیں پاتیں البتہ بطور قائمقامی یہ حصّہ پاسکتی ہیں۔

4۔شیعہ مسلک میں ذوی الفروض کی اولاد ذوی الفروض ہے اور عصبہ کی اولاد عصبہ ہے چاہے اولاد کتنا ہی نیچے درجے کا ہو۔

5۔شیعہ مسلک میں کسی قسم کی بہنیں اور اخیافی بھائی ماں کی موجودگی میں بھی حصّہ نہیں پائے گی۔

6۔شیعہ مسلک میں کسی قسم کا جد پہلی صنف کے ورثاء کی موجودگی میں کچھ نہیں پائیں گے۔

7۔شیعہ مسلک میں بڑا بیٹا اگر سمجھ دار ہے وہ اپنے باپ کے قرآن ،انگوٹھی، تلوار اور گاؤن کا بلا شرکت غیرے حق دار ہے بشرطیکہ یہ میت کی واحد جائداد نہ ہوں۔

8۔شیعہ مسلک میں بے اولاد بیوہ کو زمینوں میں کچھ نہیں دیا جاتا۔

9۔شیعہ مسلک میں حرامی اولاد نہ تو ماں اور ان کے خاندان کے میراث میں حصّہ پاسکتا ہے اور نہ ہی وہ اس کے میراث کے حق دار ہیں۔

10۔شیعہ مسلک میں میاں بیوی پر دوسرے ورثاء کے موجودگی میں رد نہیں ہوتا لیکن اگر دوسرے ورثاء نہ ہوں تو خاوند پر تو رد ہو سکتا ہے لیکن بیوی پر نہیں تاہم امیر علی بیوی پر بھی رد کے قائل ہیں۔

11۔شیعہ مسلک میں باپ بیٹی اور اخوہ کی موجودگی میں ماں پر رد نہیں ہوتا۔

12۔شیعہ مسلک میں حقیقی بہنوں کی موجودگی میں اخیافی بہن بھائیوں پر رد نہیں ہوتا اور ان کا فائدہ حقیقی بہنوں کو ملتا ہے تاہم علاتی بہنوں کی موجودگی میں اخیافی بہن بھائیوں پر درد ہوتا ہے۔

13۔شیعہ مسلک میں عول نہیں کیا جاتا ہے۔اس میں اگر حصص ترکہ سے زیادہ ہو جائیں تو وہ ورثاء جو ہمیشہ ذوی الفروض ہوں ان کو پہلے نمبر اور جو کبھی ذوی الفروض ہوں کبھی عصبات ان کا دوسرا نمبر ہے اس لئے عول کی بجائے جو پہلے نمبر والے ہیں ان کو پورا کیا جائے گا اور جو دوسرے نمبر والے ہیں ان کو پہلے نمبر والوں کو

بن عباسؓ کے بیان کردہ اصول پر عمل ہے۔اس میں حیرت ہے کہ اہل تشیع حضرت علیؓ کے مسلک کو کیسے چھوڑ رہے ہیں حالانکہ مسئلہ منبریہ مشہور مسئلہ ہے جس میں حضرت علیؓ سے بر سر منبر پوچھا گیا کہ دو بیٹیوں،ماں باپ اور بیوی کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت علیؓ نے بغیر توقف کے فوراً فرمایا۔بیوی کا نواں ہو گیا۔

## قائمقامی کا اصول

یہ اہل تشیع کے میراث کا امتیازی اصول ہے۔اہل سنت کے ہاں کسی کی اولاد اگر ایک ہی قسم کے ہوں تو سب اگر نرینہ یا زنانہ ہیں تو برابر حصّہ پاتے ہیں وگرنہ اگر نرینہ اور زنانہ ملے جلے ہوں تو پھر ان پر للذکر مثل حظ الانثیین کے اصول کا اظلاق ہو گا اور ہر مرد کو دو عورتوں کے برابر حصّہ ملے گا۔اہل تشیع کے ہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس میں پہلے ان ورثاء کے آباء واجداد جو کہ میت قریبی واسطے ہوتے ہیں ان کو چاہے مر چکے ہوں زندہ مان کر ان میں میراث تقسیم ہوتا ہے پھر ان میں ہر ایک کا حصّہ ان کے فیبٹوں بیٹیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔پھر اگر وہ مر چکے ہوں تو ان کا حصّہ ان کی اولاد میں تقسیم کیا جاتا ہے یہاں تک موجودہ ورثاء تک بذیعہ قائمقامی ان کا حصّہ پہنچ جاتا ہے۔اسی طریقے سے اہل سنت کے ہاں اجداد حقیقی کو تو ذوی الفروض میں حصّہ ملنے کے بعد عصبات میں بھی حصّہ مل سکتا ہے جبکہ جدات صحیحہ کو ذوی الفروض میں حصّہ ملتا ہے۔جو اجداد اور جدات صحیح نہیں ہیں ان کو حصّہ ذوی الارحام میں مل سکتا ہے۔اہل تشیع کے ہاں اجداد اور جدات کو حصّہ بطور قامقامی صنف دوم میّ ملتا ہے بالکل اسی طرح کہ موجود ورثاء کی اولاد جو میت سے حصّہ لیتی وہ ان کو دے کر ان کے والدین کو دی جاتی ہے وہ بھی اگر مر چکے تو پھر انکے والدین کو دیا جاتا ہے یہاں تک کہ موجودہ ورثاء تک بطور قائمقامی پہنچ جاتا ہے۔

ایک شخص نے دو بیٹے الف اور ب چھوڑے۔الف کے دو بیٹے ہیں اور ب کی ایک بیٹی۔اب اہل سنت کے نزدیک الف کے دو بیٹے میت کے پوتے ہیں اور ب کی بیٹی میت کی پوتی ہے۔اہل سنت صرف یہ جانتے ہیں کہ اس وقت میت کے دو پوتے اور ایک پوتی ہے اس لئے میت کے مال میں 1/5 پوتی کو دیں گے اور 2/5 میت کے ہر پوتے کو دیں گے۔اہل تشیع ایسا نہیں کریں گے وہ پہلے میت کے مال کو دو بیٹوں الف اور ب میں تقسیم کریں گے پس ہر ایک نصف نصف ملے گا۔اب الف کا حصّہ اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گا اور اس میں ہر ایک

کو 1 / 1،4 / 4 مل جائے گا جبکہ ب کا حصّہ اس کے واحد بیٹی کو ملے گا۔ اس صورت میں میت کی پوتی کو تو نصف ملا جب کہ پوتوں کو 1 / 1،4 / 4 مل گیا۔

اس طرح اگر صرف اجداد اور جدات ہوں تو پھر ان کو تقریباً ذوی الارحام کے صنف دوم کے امام محمدؒ کے طریقے کے مطابق حل کیا جاتا ہے۔ اس میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ امام محمدؒ اجداد کے الگ طائفے بناتے ہیں اور جدات کے الگ۔ اجداد کے طائفے کا کسر 2 / 3 اور جدات کے طائفوں کا کسر 1 / 3 رکھتا ہے۔ یہاں پر ان اجداد کے طائفے جو کسی جدات کے طائفے کے اولاد میں آتے ہوں ان کی کسر بھی 1 / 3 ہو جاتی ہے۔

14۔ اہل تشیع کے ہاں چونکہ اجداد، جدات اور میت کے بہن بھائی اور ان کی اولاد دوسرے صنف میں ہیں اس لئے یہ آپس میں شریک ہوسکتے ہیں۔ اس صورت اگر جد کے ساتھ صرف حقیقی بہنیں ہوں یا حقیقی بہنوں کے ساتھ علاتی بہن بھائی بھی ہوں تو حقیقی بہنوں کو ذوی الفروض میں ان کا حصہ دینے کے بعد باقی اگر جد اکیلا ہو تو بطور عصبہ حاصل کرے گا وگرنہ علاتی بہن بھائیوں کے ساتھ ایک بھائی کے طور پر اس کا مقاسمہ ہو گا تاہم جد کا حصّہ اگر ایک سدس سے کم بنے تو اس کو سدس بطور فرض دلوا کر باقی علاتی بہن بھائیوں میں ﴿للذکر مثل حظ الانثیین﴾ کے مطابق تقسیم ہو گا۔

اگر حقیقی بھائی موجود ہوں تو جد کو ایک بھائی سمجھ کر بہن بھائیوں کے ساتھ اس کا مقاسمہ کیا جائے تاہم اس کا حصّہ اگر ایک سدس سے کم بنتا ہو تو اس کو سدس ذوی الفروض میں دلوا کر باقی ترکہ حقیقی بہن بھائیوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے طریقے پر تقسیم ہو گا۔ حقیقی بہن بھائیوں میں کوئی نہ ہوں تو علاتی بہن بھائی حقیقی بہن بھائیوں کے قائمقام ہوں گے۔

15۔ اہل تشیع کے نزدیک صنف ثالث کے ورثاء میں ترتیب کے مطابق جن کا حق پہلے بنتا ہے صرف ان کو حصّہ دیا جائے۔ اس کے بعد والے سارے محروم ہوں گے مثلاً 3۔ الف اور 3۔ ج کے ورثاء موجود ہیں تو صرف 3۔ الف والے حصّہ لیں گے۔

پھر خاوند یا بیوی اگر ان میں کوئی ہوں ان کو حصّہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ ان کو دے کر باقی کا 2 / 3 باپ کے طرف کے ورثاء کے لئے خاص کریں اور 1 / 3 ماں کی طرف ورثاء کے لئے خاص کریں۔

باپ کے طرف کے ورثاء میں پھر دیکھیں تو پھوپھیوں اور چچاؤں کو بہن بھائی مان کر ان کا حصّہ معلوم کریں۔اسی طرح ماں کی طرف کے رشتہ داروں یعنی ماموں اور خالاؤں میں بھی کیا جائے گا۔اگر میت کے بہن بھائی نہ ہوں تو ان کی اولاد میں ان بہن بھائیوں کا مال بطریق قائمقامی میراث تقسیم ہو گا۔باقی رشتہ داروں میں بھی یہی طریقہ استعمال کیا جائے گا کہ باپ کی طرف کے رشتہ داروں کو 2/3 اور ماں کی طرف کے رشتہ داروں کو 1/3 دیا جائے اور پھر ان میں باقی رشتے ماں اور باپ کے حوالے سے متعین کر کے بطریق قائمقامی ان کو ان کا حصّہ دلوایا جائے گا۔

## چند بے قاعدگیاں

D.F Mulla اپنی کتاب Mahomedan Law میں رقمطراز ہے کہ اگرچہ عام قانون تو یہ ہے کہ تیسرے صنف میں چچاؤں کو چچازاد پر فوقیت حاصل ہے لیکن اہل تشیع چونکہ علیؓ کے پیروکار ہیں اس لئے انہوں نے علیؓ کو جو کہ آپ ﷺ کے حقیقی چچازاد تھے حضرت عبّاس پر جو کہ آپ ﷺ کے علاتی چچا تھے پر فوقیت دلانے کے لئے یہ اسثنائی قانون بنادیا کہ حقیقی چچازاد کو علاتی چچا پر فوقیت حاصل ہے۔اس سے اس الزام کو بڑی تقویت مل رہی ہے کہ اہل تشیع نے صرف سیاسی مصلحتوں کی خاطر شریعت کو تبدیل کرلیا۔ بیٹی کے اولاد کو بھی حصّہ دلوایا کیونکہ حسنین کریمینؓ بیٹی کے اولاد تھے۔ایک یورپی محقق پروفیسر کُلسن نے اپنی کتاب Succession in Islamic Law میں ایک جگہ اہل تشیع کے طریقہ تقسیم کی بہت تعریف کی ہے۔اب ایک طرف پروفیسر کے نام کو دیکھا جائے اور دوسری طرف اس تعریف کو دیکھا جائے تو دونوں میں بظاہر کوئی مطابقت نظر نہیں آرہی ہے۔پروفیسر نے اہل تشیع کے سیاسی مصلحتوں کے لئے شریعت میں مداخلت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس مداخلت کو انہوں نے دو طریقوں سے ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی بالکل اس طرح جیسے کوئی وکیل صفائی اپنے مؤکل کے جرم کا تو دل میں اقرار کر رہا ہو لیکن دلائل کے ذریعے اس کے جرم کو ہلکا ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔وجہ کچھ بھی ہو ایسا کام ان کے تحقیقی کاموں کے ساتھ بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسا کہ مخمل میں کوئی ٹاٹ کا پیوند لگادے۔پروفیسر تو اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں ان کے اس طرز عمل کی اب اس قسم کی اصلاح کی صورت تو ممکن نہیں رہی کہ وہ اس کو سمجھ کر رجوع کر سکے تاہم ان سطور کی ان کی

قاصر ہیں۔ان میں وہ اہل سنت وکیل بھی ہیں جو پروفیسر صاحب کے FAN ہونے کے ناطے سے ان کی تحریروں کو صحیح سمجھ کر غلطی کو غلط نہیں سمجھ پا رہے۔ایسے لوگوں کی اصلاح ضروری ہے کہ ان پر حق واضح ہو جائے اور اگر وہ خود محقق کہلانا چاہیں تو تحقیق کا حق ادا کر سکیں۔زیر نظر چند سطور پروفیسر صاحب کے غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے وقف کئے جا رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ حق تک ہم سب کا پہنچنا آسان فرمادے۔

پروفیسر صاحب اہل تشیع کے میراث کو سادہ اور آسان کہہ رہے ہیں۔اس کی وجہ سمجھ نہیں آتی کیونکہ دو چیزوں میں آسان ہم اس کو کہیں گے کہ یا تو ان کے قواعد کو مرتب کرنا آسان ہو یا ان قواعد کا استعمال آسان ہو۔ان دونوں احتمالوں کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔

پہلے احتمال میں دو باتیں ہیں۔

الف۔ہر دو فریقوں کا اصول فقہ میں کیا فرق ہے

ب۔ان کے اصولوں کے مطابق قوانین کے اجراء میں کیا مشکلات اور آسانیاں ہیں۔

الف۔اہل سنت کے قواعد قرآن اور سنت سے ماخوذ ہیں۔ان میں جو سنت سے ماخوذ ہیں ان میں اگر صحابہ کا اجماع ہے تو اہل سنت میں اختلاف نہیں ہے اور اگر صحابہ میں کسی بات میں اختلاف ہے تو یہ اختلاف آئمہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ہر ایک کا جو جس بات میں جو شرح صدر ہوا وہی انہوں نے لیا۔اہل تشیع نے سنت کی تشریح یہ کی کہ وہ روایت قبول کی جائے گی جو اہل بیت سے مروی ہو اور امام نے اگر اس کی توثیق کی تو وہ قانون ہے نہیں تو واقعات میں غور کرنے کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ انہوں نے پیش کیا۔ان دونوں کے اندر غور کرنے سے قطع نظر اس کے کونسا حق ہے اور کونسا نہیں آسانی اور مشکل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی فرق نہیں۔

اہل سنت نے اپنے اصول فقہ کو استعمال کر کے ذوی الفروض متعین کئے۔یہ کل چودہ ہیں۔ان میں جدات صحیحہ سنت سے ثابت ہیں باقی قرآن اور ان کے آیات مبارکہ سے استنباط کرنے سے۔سنت سے یہ بہت آسانی کے ساتھ خلفائے راشدین کے دور میں ہی یہ طے ہوا کہ جدات کا مجموعی حصّہ 1 / 6 ہے اور جتنے بھی صحیح جدات موجود ہوں گی ان میں یہ برابر تقسیم ہو گا۔اب صحیح جدات کونسی ہیں یہ سنت میں غور کرنے معلوم ہوا کہ تین قسم کے جدات ماں کی ماں، باپ کی ماں اور جد کی ماں۔امام مالک نے پہلے کے دو اور ان کی اوپر کی مائیں اس سے مراد لیں۔حنابلہ نے ان کے ساتھ جد کی ماں اور ان کی اوپر کی مائیں شامل کیں اور احناف اور شوافع نے

جد سے تمام جد صحیح لئے اس لئے اس میں سارے جد صحیح کی مائیں اور ان کی مائیں نانیاں آ گئیں۔ لہٰذا ان میں سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں۔

دادا کو احناف اور حنابلہ نے ابو بکر صدیقؓ کے قول کے مطابق اب کا قائمقام سمجھا تو اس کو باپ کی طرح ذوی الفروض اور عصبات میں شامل کیا جبکہ مالکیہ اور شوافع نے حضرت زید بن ثابتؓ کی پیروی میں ان کو بہن بھائیوں کے ساتھ شریک کر لیا۔ اصول سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں۔

پوتیوں، پڑپوتیوں اور سکڑپوتیوں کو آثار صحابہ کے مطابق اہل سنت نے بیٹی کا قائمقام سمجھا لہٰذا وہ بیٹی کے طرح ذوی الفروض اور عصبہ بن گئے البتہ بیٹی چونکہ بیٹے کے بغیر عصبہ نہیں بنتی اس لئے عصبات میں حصّہ لینے کے لئے عصبہ مع الغیر ہونا ضروری ہے اس لئے ان میں سے جو کوئی بھی عصبہ مع الغیر بنے وہ اپنے ساتھ ان تمام اوپر کی بنات بھی عصبہ مع الغیر بنا دیں گی پوتی اور پڑپوتی کے ساتھ کوئی عصبہ نہیں جن کے ساتھ وہ مع الغیر بن جائے لیکن سکڑپوتی کے ساتھ ہے تو اب سکڑپوتی صرف عصبہ نہیں بنے گی بلکہ پوتی اور پڑپوتی بھی اس کے ساتھ عصبہ مع الغیر ہوگی کیونکہ اگر اسفل عصبہ بن سکتی ہے تو ان سے اعلیٰ کیوں نہیں؟۔ یہی مسئلہ تشبیب کہلاتی ہے اور بہت مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن دیکھیئے کیسے بے غبار آسانی کے ساتھ حل ہوا۔

بہنوں کا حصّہ قرآن سے ثابت ہے۔ اس میں اختلاف صرف کلالہ کی تعریف میں ہے۔ اس کی جو بھی تعریف کسی نے کی ہے اس کے مطابق اس کا مسلک سمجھنا بہت آسان ہے۔

ماں کا حصّہ قرآن سے ثابت ہے لیکن والدین کے ساتھ جب زوج یا زوجہ جمع ہو جائے اس میں اختلاف ہو سکتا تھا لیکن اہل سنت نے خلفائے راشدین کے طرز عمل سے اس اصول پر اتفاق کر لیا کہ باپ کا حصّہ ماں سے کم نہیں ہونا چاہیئے اس لئے زوج یا زوجہ کو حصّہ دینے کے بعد جو حصّہ بچتا ہے اس میں قرآنی اصول ثلث کا اجراء کیا۔ اس کا سمجھنا بھی بہت آسان ہے۔

## زوج اور زوجہ کے حصّہ میں کوئی اختلاف نہیں

اس سے ذوی الفروض کے حصّے ثابت ہو گئے اب رہ گئے عصبات تو عصبات میں پہلا قانون تو قرآن سے ثابت ہوتا للذکر مثل حظ الانثیین کا جب اولاد میں نرینہ زنانہ دونوں ہوں اور اگر صرف زنانہ ہوں تو وہ ذوی

دینے کا امر ہے۔اب پہلے کون ہے اور بعد میں کون ہے اس میں بھی سنت سے مدد لی گئی جس میں پوری ترتیب دی ہوئی ہے کہ کس کے بعد کیا ہے۔لہٰذا اہل سنت کے عصبات بلاشبہ ان کے اصولوں کے مطابق بلا غبار ثابت ہوئے۔اب رہ گئے ذوی الارحام چونکہ ان میں قرآن میں صرف ایک اشارہ ہے جس کے سمجھنے میں اہل سنت میں اختلاف ہے۔اس کی باقی تشریحات آثار صحابہ سے ماحوذ ہے اس لئے اس میں اہل سنت میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔کچھ تو اس کے سرے سے قائل ہیں نہیں اور جو قائل ہیں ان میں ان کے درمیان تقسیم کرنے میں اختلاف ہے تاہم جن کا جو اصول ہے وہ ان کے شرح صدر کے مطابق آسانی کے ساتھ ثابت ہو سکتی ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک تین اصناف ہیں۔پہلی صنف میں میت کے والدین اور اولاد ہیں۔یہ آپس میں شریک ہوتے ہیں اور ان کا شریک ہونا قرآن سے ثابت ہے البتہ اولاد میں کون آتے ہیں ان میں اہل سنت کے ساتھ دو اختلاف ہیں۔ایک تو یہ پوتی پڑپوتی اور سکڑپوتی ان کو اہل تشیع ذوی الفروض تسلیم نہیں کرتے۔دوسرا یہ کہ ان کو حصّہ مل سکتا ہے تو قائمقامی کے اصول سے۔قائمقامی کے اصول کو وہ اپنے فقہ سے لیتے ہیں۔کس طرح لیتے ہیں ان کا ثبوت ان کے ذمّہ ہے بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ جس کو اہل سنت سنت کہتے ہیں اہل تشیع ضروری نہیں کہ اس کو سنت کہیں کیونکہ ان کے نزدیک اہل سنت کا سنت میں معتبر ترین کتاب بخاری بھی ایک موضوع کتاب ہے۔لہٰذا اس پر بات نہیں ہو سکتی۔لیکن اس کے تخریج میں آسانی سمجھ نہیں آتی کہ پروفیسر کُلسن کو کہاں نظر آرہی ہے۔

دوسرے صنف میں اجداد، جدات اور بہن بھائی ہیں۔اخوہ مع الجد کے مسئلے میں تو اہل سنت کے دو امام امام مالک اور امام شافعی شریک ہیں البتہ طریقہ کار میں تھوڑا فرق ہے۔اس میں حنابلہ اور احناف کا مسئلہ سنت کے ذریعے سمجھنا اس لئے زیادہ آسان ہے کہ اس میں استثنائیات نہیں ہے جبکہ اہل تشیع اور اہل سنت کے دو اماموں کے مسلک کو سنت سے ثابت کرنا ویسے تو آسان ہے لیکن استثنائیات ذرا مشکل ہیں جیسے کہ مسئلہ اکدریہ اسی سے اور وہ مشکل مسئلہ تھا۔اس میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل سنت کے دو امام اہل تشیع سے زیادہ آسان طریقہ پیش کررہے ہیں اور دو امام ان کی طرح۔اگر صرف جد اور اجداد ہوں تو اہل تشیع کے ہاں یہ اہل سنت کے ذوی الارحام کے صنف

جس کی بہت کم ہی ضرورت پڑتی ہے جبکہ اہل تشیع میں بنیادی صنف دوم میں آتی ہے جس کی ضرورت کافی پڑتی ہے۔

تیسرے صنف کے ورثاء میں اہل تشیع نے چھ قسمیں بنائی ہیں۔ان کا سارادارو مدار قیاس پر ہے۔اس میں بھی اپنے ہی بنائے اصول میں استثناء کرنا پڑا یعنی حقیقی چچازاد کو علاتی چچا پر فوقیت دلوانا حالانکہ یہ اس ترتیب کے بالکل خلاف ہے جو انہوں نے صنف ثالث کے لئیے وضع کیا ہے۔اہل سنت کے ہاں اہل تشیع کے صنف سوم کے سارے ورثاء ذوی الارحام میں آتے ہیں۔

## حساب میں آسانی اور مشکل

اب یہ دیکھا جائے گا کہ حس فریق کے جو بھی قواعد بن گئے ہیں۔ان پر عمل کتنا آسان یا مشکل ہے؟

اہل سنت کے نزدیک 99٪ سے زیادہ مسئلے ذوی الفروض اور عصبات کے ہوتے ہیں۔ان کا حساب سیکھنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔احقر کے کتاب میں اس کا جو طریقہ دیا ہوا ہے مناسخہ سمیت اس کو ایک دن میں سیکھا جاسکتا ہے۔یہ اصل میں دو جدولوں کا استعمال ہے۔اس میں ایک جدول ذوی الفروض کا ہے اور دوسرا عصبات کا۔ذوی الفروض کے جدول کے مطابق حصّے اگر پورے پورے تقسیم ہوئے تو اب مزید کچھ کرنا ہی نہیں ۔نہیں تو عصبات کے جدول سے رہنمائی لے کر مستحق عصبات میں باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔عصبات کا جدول سیکھنا پانچ منٹ کا کام ہے جس سے سارے عصبات سمجھ میں آجاتے ہیں۔اہل سنت کا یہاں تک میراث صرف تین طریقوں کے ذریعے سیکھا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی ذوی الارحام کا مسئلہ آجائے اگرچہ اس کا امکان کم ہوتا ہے تو اگر امام ابو یوسف ؒ کے مسلک پر سوال حل کرنا ہے تو اس کو آدھے گھنٹے میں سیکھا جاسکتا ہے۔اگر امام احمد بن حنبل ؒ کے مسلک کے مطابق مسئلہ حل کرنا ہو تو یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا مسئلہ ہے اور اگر امام محمد ؒ کے مسلک پر عمل کرنا ہے تو اس کے سیکھنے کیلئے ایک دن درکار ہوگا۔

اہل تشیع کے مطابق میراث تقسیم کرنے میں پہلی مشکل یہ ہے کہ اس میں استثنایات ہیں۔ترکہ میں بھی بڑے بھائی کے ترجیحات ہیں اور لاولد بیوہ کے لئے کچھ رکاوٹیں ہیں۔پھر ہر صنف میں محدود ورثاء ہیں اس لئے رد جو کہ نسبتاً حساب میں مشکل ہوتا ہے کا امکان زیادہ ہوتا ہے اس پر مستزاد کہ اہل، تشیع کے ہاں رد کا

طریقہ اہل سنت کے طریقے کی طرح اتنا سادہ نہیں بلکہ اس پر کچھ قدغنیں ہیں۔اہل سنت کے ہاں میاں بیوی پر رد نہیں ہوتا جبکہ اہل تشیع کے نزدیک اگر اور ورثاء نہ ہوں تو خاوند پر تورد ہو سکتا ہے۔بیوی پر نہیں۔اہل تشیع کے نزدیک عول کی بجائے مقدم اور مؤخر پر انحصار ہے اس لئے اہل سنت کے جدید حساب میں جو عول خود بخود ہو جاتا ہے کے بجائے ایک پیچیدہ حساب سے گزرنا پڑتا ہے۔

دوسری صنف میں اخوہ مع الجد کی مشکل صورت حال ہے۔اور اگر صرف اجداد اور جدات ہوں تو ان کا حساب بھی اتنا سادہ نہیں کیونکہ اس کا حساب ذوی الارحام کے صنف دوم کی حساب کی طرح ہے جو اہل سنت کے حسابات میں مشکل حساب سمجھا جاتا ہے۔

تیسری صنف کا حساب تو کافی پیچیدہ ہے۔اس میں قائمقامی کا اصول قانون کے طالبعلم کا خون خشک کرنے کے لئے کافی ہے۔مجھے نہیں معلوم پروفیسر کُلسن اس صنف کے حسابات جاننے کے باوجود قانون کے طالبعلم کے لئے اہل تشیع کے طریقہ حساب کو آسان کیوں سمجھتے تھے خیر یہ تو ان کی بات ہے جس کا جواب اس کے ذمّے تھا لیکن اب قانون کے طالبعلموں کو یہ بات خود معلوم کرنا چاہیئے کہ کونسا حساب سادہ اور کونسا پیچیدہ ہے۔

اس تمام تحریر کا نچوڑ یہ ہے کہ اہل سنت کے اماموں میں اختلاف کی وجہ سے بعض جگہ کچھ آسانیاں اور بعض جگہ کچھ۔ان میں جہاں جہاں مشکلات ہیں وہ سب اہل تشیع نے اپنے طریقوں میں جمع کئے ہیں۔اس کو آسان کہنا اگر زیادتی نہیں تو عجیب ضرور ہے۔

مُقِرّلَہ ▪ بِالنَّسَبِ عَلَى الْغَيْرِ

حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ،حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُحَارِبِي عَنِ الأَعْمَش ،عَنْ إِبْرَاهِيمَ فِى الإِخْوَةِ يُدَّعِى بَعْضُهُمُ الأَخَّ وَيُنْكِرِ الآخَرُونَ ،قَالَ :يَدْخُلُ مَعَهُمْ بِمَنْزَلَةِ عَبْدٍ يَكُونُ بَيْنَ الأَخْوَةِ ،فَيُعْتِقُ اَحَدُهُمْ نَصِيبُه ▪ ـقَالَ :وَكَانَ عَامِرٌ ،وَالْحَكَمَ ،وَاَصْحَابُهُمَا يَقُولُونَ :لَايَدْخُلُ فِى نَصِيبِ الَّذِى اِعْتَرَفَ بِهِ

ـ رواہ الدارمی حدیث رقم 3065،باب الادعّاء و الانکار

و قَالَ الدَّارِمِی :اَخبَرَنَا اَبُو نُعِیمٍ ، قَالَ : قُلتُ لِشَرِیكٍ :کَیفَ ذَکَرٍ فِی الاَخوَینِ یُدَّعِی اَحَدُھُمَا اَخًا قَالَ : یَدْخُلُ عَلَیْهِ فِی نَصِیبِهِ ،قُلْتُ مَنْ ذَکَرَہ ؟ قَالَ : جَابِر،عَنْ عَامِرٍ-عَنْ عَلِیٍ- حدیث رقم 3064،باب الادعّاء و الانکار۔

پہلی روایت ان بھائیوں کے بارے میں ہے جن میں کوئی کسی کے بارے میں بھائی ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور کچھ انکار۔ تو فرمایا کہ وہ ان بھائیوں کے درمیان اس غلام کی طرح ہے جو اپنے حق کے بارے میں اسے آزاد کر دیتے ہیں یعنی اس صورت میں جس کے بارے میں جو اقرار کر رہا ہے وہ اسی اقرار کنندہ کا حصّہ پا سکتا ہے جبکہ دوسری روایت میں دو بھائیوں میں اس بھائی کے بارے میں جن میں ایک اس کے بھائی ہونے کا اقرار کرتا ہے حکم بتایا گیا ہے کہ وہ اس کے حصے کا حق دار ہے اور یہ روایت علیؓ سے ہے۔

وہ شخص جس کے بارے میں کوئی ایسے رشتے کا اقراری ہو جس کی نسبت کسی غیر سے ہو اور اس کے بارے میں وہ کوئی شھادت بھی نہ دے سکتا ہو تو اس کو مقرلہ بالنسب علی الغیر کہتے ہیں مثلاً کسی کسی کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ میرا بھائی ہے لیکن اس کا باپ اس کے بیٹے ہونے کا اقرار نہیں کر رہا ہو تو جس کے بارے میں اقرار کیا جا رہا ہے مقرلہ بالنسب علی الغیر کہلائے گا۔ احناف کا مسلک اس میں یہ ہے کہ ذوی الفروض، عصبات، مولیٰ عتاقہ ، ذوی الارحام اور مولیٰ الموالات اگر کسی میت کے نہ ہوں تو پھر مال مقرلہ بالنسب علی الغیر کو دیا جائے گا۔ دارمی کے ایک روایت کے مطابق حضرت عمر نے قاضی شریحؒ کو لکھا کہ حمیل کو میراث اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک کہ اس پر شھادت قائم نہ ہو چاہے کوئی عورت اس کو اپنی جھولی میں لائی ہو۔( 71)۔

حمیل سے مراد وہ ہے جس کو کسی غیر کے نسب پر محمول کیا جائے مثلاً کوئی عورت یہ کہتی رہے کہ یہ بچہ میرے خاوند کا بچہ ہے لیکن اس پر اس کے ساتھ شھادت موجود نہ ہو یا کوئی مرد کسی اور کے بارے میں کہے کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے ساتھ اس پر شھادت نہ ہو تو یہ مقرلہ صرف اس شخص کے حق میں وارث ہے جس نے اس کے حق میں اقرار کیا ہے لیکن اگر اس پر شھادت قائم ہو جائے تو پھر یہ سب کا وارث ہو گا۔ یہی تو وہ موقع ہے جس کے بارے میں دارمی روایت کرتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمرؓ و عثمانؓ حمیل کو میراث دیتے تھے( 72) ۔ امام محمدؒ نے الموطأ میں امام مالکؒ کے طریق سے سعیدؒ بن المسیب سے روایت کیا کہ عمرؓ نے اس عجمیؑ کو جو عرب میں پیدا نہ ہوا ہو میراث دینے سے انکار کیا(73 ) اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ اس سے ہم دلیل

پکڑتے ہیں کہ اسیروں میں اگر کوئی عورت کہتی پھرے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا یہ میرا بھائی ہے یا یہ میری بہن ہے تو اس کو( صرف اس اقرار کی وجہ سے ) اس نسب کے مطابق میراث نہیں ملے گی کیونکہ نسب بغیر شہادت کے قائم نہیں ہوتا لیکن یہ اقرار اگر غیر پر نہیں خود اپنے پر ہو تو فیصلہ مختلف ہو گا مثلاً اگر بیٹے یا والد کے بارے میں اقرار ہو پس والد اگر کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے اور وہ بیٹا تصدیق کرتا ہے تو نسب ثابت ہو جائے گا بشرطیکہ وہ بیٹا غلام نہ ہو کیونکہ غلام کا اقرار آقا کے اقرار پر موقوف ہے پس وہ بیٹا جب تک غلام ہے یا اس کا مالک اس کی تصدیق نہیں کرتا اس وقت تک اس کا بیٹا نہیں سمجھا جائے گا۔اس طرح اگر عورت کسی بچے کو جنے اور کوئی آزاد عورت اس کی تصدیق کرے تو وہ اس کا بیٹا قرار پائے گا۔یہ قول امام ابو حنیفہؒ اور عام فقہاء کا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام محمدؒ نے حضرت عمرؓ کے کلام کو اس معنی پر محمول کیا ہے۔کہ وہ عجمی جو اسیر ہو کر آئے میراث نہیں پائے گا کیونکہ اس کا نسب ان میں سے بعض کے اقرار پر مبنی ہے اور یہ حجت نہیں کیونکہ یہ غلام ہیں اور غلام کا اقرار مالک کے اقرار پر موقوف ہے۔ہاں اگر اسیر ہونے کے بعد کوئی پیدا ہو جائے تو اس کا نسب ثابت ہو جائے گا کیونکہ یہ واقعہ لوگوں کو معلوم ہو گا صرف اقرار پر مبنی نہیں ہو گا۔

ابن حزمؒ محلی میں یحیٰؒ بن سعید الانصاری سے روایت کرتے ہیں کہ " صالحین حقیقت کو پا گئے جو کہتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ اہل عجم جو شرک کی زمین پر پیدا ہوئے اور بعد میں اسیر ہوئے میراث نہیں پائیں گے اور حضرت عمرؒ بن عبد العزیز، عروۃ بن بن زبیر ، عمرو بن عثمان بن عفان، ابی بکر بن سلیمان بن ابی حثیمہ اور ابی بکر بن عبد الرحمان بن الحارث بن ہشام روایت کرتے ہیں کہ عجمیوں کی ولادت سے ان کی نسب ثابت نہیں ہو گی الا کہ وہ عرب میں پیدا ہوا ہو (74) " اور اس کی علت انقطاع بتائی ہے۔صاحب اعلاء السنن لکھتے ہیں کہ اس میں یہ علت نہیں پائی جاتی کیونکہ یہ کئی طرق سے ثابت ہو جن میں سے بعض بعض کو قوت دے رہے ہیں۔جہاں تک بن حزمؒ کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ عمرؓ نے حفصہؓ اور عبد اللہؓ کو جو میراث دی وہ بھی تو ولادت شرک کی میراث تھی تو یہ ابن حزم سے سہو ہوا ہے کیونکہ عمرؓ و عثمانؓ کے اقوال کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ ولادت شرک کی میراث نہیں دی جا سکتی بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ عجمیوں کا نسب جب وہ اسیر ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے تو فقط اقرار سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ وہ غلام ہوتے ہیں اور غلام کا اقرار آقا کے اقرار پر موقوف ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے شہادت قائم ہونی چاہیے لیکن اگر کوئی بلد شرک میں پیدا ہوا، بغیر غلامی کے ہجرت کی یا

مسلمان ہوئے اور غلام نہیں ہوئے تو ان کا اقرار چونکہ کسی اور (آقا) پر موقوف نہیں بلکہ آزاد کا اقرار آزاد کے لئے ہے اس لئے اس پر شہادت کی پابندی نہیں اور اگر کوئی مسلمانوں کی قید میں یا غلامی میں پیدا ہوا تو اس کا نسب ثابت ہو جائے کیونکہ یہ ایک معلوم واقعہ ہو گا۔ یہ ابن حزمؒ کے اس قول پر دلالت کرتا ہے جو وہ طریق عبدالرزاقؒ سے روایت کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے شریحؒ کو لکھا کہ: " حمیل کو میراث نہیں دی جائے مگر شہادت قائم ہو جانے کے بعد" (75) اور اسی طریق سے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے لکھا کہ: " ولادت کفر کے حملاء کو میراث نہیں ملے گی" (76)۔ جس پر حسنؒ اور ابن سیرینؒ نے تنقید کی کہ اس وقت کیا ہو گا جب یہ حملاء معروف ہوں اور ان پر شہادت بھی قائم ہو چکی ہو تو احناف کہتے ہیں کہ کہ اس وقت میراث ولادت پر نہیں بلکہ شہادت پر ہی مبنی ہو گا اور اس کا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے انکار نہیں کیا کیونکہ حمادؒ بن سلمہ کے طریق سے ابن سیرینؒ اور حسنؒ دونوں یہ روایت کرتے ہیں کہ جب شہادت قائم ہو جائے تو حمیل کو میراث ملے گی (77) اور یہی قول شعبیؒ اور نخعیؒ دونوں سے حماد بن سلمہ کے طریق سے مروی ہے (78)۔ اور یہی سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ، ابی سلیمانؒ اور ان کے اصحاب کی رائے ہے۔ اس بحث کا نچوڑ یہ نکلا کہ کوئی اگر کسی کے بارے میں اقرار کرتا ہے کہ اس کا میرے ساتھ فلاں رشتہ ہے تو اگر وہ رشتہ کسی اور کے ذریعے سے ہو براہ راست اقرار کنندہ کے ذریعے نہ ہو تو اس کو اس پر شہادت مہیا کرنا پڑے گا اگر وہ شہادت قائم کر سکا تو اس کا رشتہ اس کے ساتھ ثابت ہو جائے گا اور وہ اس رشتہ کے مطابق باقاعدہ اپنے مورثوں کا وارث ہو گا لیکن اگر اس کا اقرار کسی ایسے شخص کے متعلق ہو کہ وہ رشتہ اسی اقرار کنندہ کے واسطے سے ہو تو پھر شہادت کی ضرورت نہیں الا کہ مقرلہ غلام ہو تو اس کا اقرار اس کے آقا کے صوابدید پر ہے۔ اگر مقرلہ کے حق میں اقرار کنندہ شہادت قائم نہ کر سکا تو اگر اس کا کوئی اور وارث نہ ہو تو پھر مقرلہ صرف اس کے مال کا وارث ہو گا۔ اس رشتے کے مطابق باقی مورثوں کے نہیں۔ واللہ اعلم

## حمل کا حصہ

حَدَّثَنَا حُسَيْنُ بْنُ مُعَاذٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْاَعْلٰى حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ يَعْنِى ابْنَ اِسْحٰقَ عَنْ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ قُسَيْطٍ عَنْ اَبِى هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِىِّ ﷺ قَالَ اِذَا اسْتَهَلَّ الْمَوْلُودُ وُرِّثَ رواہ ابوداؤد

حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ حَدَّثَنَا الرَّبِيعُ بْنُ بَدْرٍ حَدَّثَنَا اَبُوالزُّبَيْرِ عَنْ جابر قَالَ النَّبِی ﷺ اِذَا اسْتَهَلَّ الصَّبِیُّ صُلِّیَ عَلَيْهِ وَ وَرِثَ رواہ ابن ماجہ حدیث رقم 1508، ابواب الجنائز۔ باب ماجاء فی الصلوٰۃ علی الطفل۔

یہ احادیث شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حمل کو اس وقت حصّہ مل سکتا ہے جب اس سے زندہ بچہ پیدا ہوا اور یہ حیات استہلال پر موقوف ہے۔ حمل سے مراد عورت کے پیٹ میں بچہ ہے چاہے وہ کسی بھی مرحلے کا ہو۔ حمل کا حصہ لینے میں تو سارے فقہاء کا اتفاق ہے (104) تاہم اس کی تفصیلات میں اختلاف ہے جن کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔ حمل کی کم سے کم مدت بالاتفاق چھ مہینے ہے (128) جس کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیت مبارکہ ہے وحملہ وفصالہ ثلٰثون شہراً۔ پس فصال کے دو سال نکال کے چھ مہینے رہتے ہیں جو کہ حمل کے لئے کم سے کم مدت ہو سکتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (129) اور امام احمد بن حنبلؒ کے ایک قول کے مطابق (114,118) دو سال ہے۔ ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کا قول

لَايَبْقِى الوَلَدُ فِى رَحِمِ اُمِّهِ اَكْثَرَمِنْ سِنَتَيْنِ وَلَوْبِظِلِّ مِغْزَلٍ وَ(فِى رَوَايَةٍ) لَوبِفَلْكِهِ مِغْزَلٍ

(سُنَنْ دَارُقُطْنِی وَ بَيْهَقِی بَرَوَايَتِ جَمِيلَه بِنْتِ سَعْدٍ)

ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں کسی طرح بھی دو سال سے زیادہ نہیں رہتا کیونکہ اس طرح کی بات قیاس سے نہیں ہو سکتی انہوں نے حضور ﷺ سے سنا ہو گا پس ایسی حالت میں صحابی کا قول حدیث کے قائمقام ہو گا۔ حنابلہ (130)، شافعیہ (119) اور مالکیہ (114) کے مشہور قول کے مطابق حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے کیونکہ ان کے نزدیک جب اس مسئلہ میں نص موجود نہیں تو پھر واقعہ کا دیکھنا پڑے گا اور واقعہ میں حمل چار سال سے زیادہ ٹھہر چکا ہے۔ مالکیہ کا دوسرا قول (116) پانچ سال کی مدت کا بھی ہے جبکہ سراجی کے مطابق زھری کا سات سال ہے۔ حمل کی میراث اس وقت ثابت ہو گی جب میت کی موت سے پہلے حمل قرار پاچکا ہو اور بچہ زندہ پیدا ہو۔ اس میں حمل اگر میت سے ہو تو پھر تو زیادہ سے مدت کا اعتبار ہو گا یعنی احناف کے نزدیک میت کی موت کے بعد اگر بچہ دو سال کے اندر اندر پیدا ہوا اور اس کی بیوی

اعتبار ہو گا پس حمل میت کا بھائی یا بہن ہو تو پھر اگر میت کی موت کے چھ مہینے کے اندر اندر پیدا ہو جائے تو وہ میت کا وارث ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

جس وقت بچہ پیدا ہو جائے تو احناف کے نزدیک اگر بچہ میں زندگی کے آثار پائے جائیں یا بچہ مرا ہوا ہو لیکن اس کی ماں پر تشدد کیا گیا ہو یا بچہ مرا پیدا ہوا ہو لیکن جس وقت وہ پیدا ہو رہا تھا تو اس کا اکثر حصّہ ایسی حالت میں نکلا تھا کہ وہ زندہ تھا تو ان حالات میں بچہ میراث پائے گا اور اس سے میراث لی بھی جا سکتی ہے۔ سراجی میں ہے کہ اگر بچہ معروف طریقے سے باہر نکلے تو اعتبار سینے کا ہو گا اور اگر الٹے طریقے سے ہو تو اعتبار ناف کا ہو گا یعنی پہلی صورت میں سینہ اور دوسر صورت میں ناف نکل آنے تک بچہ زندہ رہا ہو تو اس کو زندہ شمار کیا جائے گا۔ اسطرح اگر بچہ کم از کم ایک دفعہ روئے تو بچہ سب کے نزدیک وارث ہے لیکن اگر رویا نہیں تو پھر اس میں تفصیل ہے تو مالکیہ کے نزدیک (104) اور امام احمد بن حنبلؒ کے ایک روایت (118) بچہ وارث نہیں ہے ان کی دلیل مذکورہ احادیث شریفہ میں " اذا استھل المولود ورث " ہے یعنی جس وقت بچہ روئے تو وہ میراث پائے گا ورنہ نہیں۔ وہ حضرات رونے کو ہی حیات کا یقینی سبب سمجھتے ہیں باقی علامات کو مذبوح کی حرکت کی طرح سمجھ کر قابل رد سمجھتے ہیں۔ (118)۔ اس کے برعکس احناف (131)، شوافع (130) اور امام احمدؒ کے ایک قول (118,120) ارونے کو حیات کی دلیل کے طور پر لیتے ہیں اس لئے اس کی حیات کی کوئی دوسری دلیل بھی مل جائے تو اس سے بھی بچہ ان کے نزدیک وارث ہو جائے گا۔ ااس بچے کے بارے میں جو پیدا ہوتے وقت روئے تو نہیں لیکن اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جس سے حیات کا پتہ چل جائے مثلاً آنکھیں جھپکے یا دودھ پیئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر اگر اس کو کوئی قصداً قتل کرے تو کیا اس سے قصاص یا دیت نہیں لیا جائے گا؟ پس اگر جواب ہاں میں ہے تو یہ بات پھر عجیب ہو گی کہ اس بچے کو میراث تو نہ دیا جائے لیکن اس کے قاتل عمد سے قصاص یا دیت لیا جائے یہ تو واضح تضاد ہو گا۔ کیونکہ انہوں نے جب مان لیا کہ بچہ زندہ تھا تو وہ میراث کے حق میں کیسے مردہ سمجھا جائے گا؟ (131)۔ دوسری بات یہ کہ لغت کے اعتبار سے اِسْتِهْلَالْ چاند کے ظاہر ہونے کو بھی کہتے ہیں پس یہاں پر استھلال سے مراد بچے کا زندہ پیدا ہونا بھی لیا جا سکتا ہے۔ (107) مالکیہ کی ایک دلیل روایت ﴿حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَسَّانَ حَدَّثَنَا يَحْيَى هُوَ ابْنُ حَمْزَةَ عَنْ يَزِيدَ بْنِ وَاقِدٍ عَنْ مَكْحُولٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرِثُ

الْمَوْلُودُ حَتّٰى يَسْتَهِلَّ صَارِخًا وَاِنْ وَقَعَ حَيًّا﴾ بھی ہے لیکن یہ روایت مرسل ہے اور اس میں احناف کے نزدیک وَاِنْ وَقَعَ حَيًّا مکحول کا اضافہ ہے۔ واللہ اعلم (107)۔

علماء کرام حمل کے حصہ میں بھی مختلف رائے رکھتے ہیں۔ شوافع اپنے مشہور قول کے مطابق (118) اور مالکیہ راجح قول کے مطابق (114) میراث کی تقسیم کو مؤخر کرتے ہیں کیونکہ حمل کے بارے میں کسی کو کیا پتہ ہے کہ وہ کیا ہے اور کتنے ہیں جبکہ حنابلہ (118) ، احناف (117) اور شوافع کے معتمد قول (132) کے مطابق باقی ورثاء کو حمل کی وضع تک صبر پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے بعض اوقات نقصان ہو سکتا ہے۔ جو قبل از وضع حمل تقسیم کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی کئی اقوال ہیں۔ شوافع کے نزدیک (132,119) جن کا حصہ ہر صورت میں ممکن ہو تو ان کو جو کم سے کم ممکن ہو دیا جائے، جن کا ہر صورت میں ایک ہی حصّہ بنتا ہو ان کو پورا حصّہ دیا جائے اور جن کا کبھی حصّہ بنتا ہو کبھی نہیں ان کا حصّہ وضع حمل تک موقوف رکھا جائے۔ (121)۔

شریک کے مطابق حمل کو چار لڑکے یا لڑکیاں فرض کیا جائے گا ابن مبارکؒ کے نزدیک یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول بھی ہے اور ربیع کی روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت سعد بن لیث کی روایت میں امام محمدؒ کا قول تین لڑکوں اور تین لڑکیوں کا ہے۔ حنابلہ کے نزدیک (115) حمل کو دو لڑکے یا دو لڑکیاں تصور کرکے ان میں ہر دو صورتوں میں تمام ورثاء کے حصوں کا حساب کیا جائے جس کا جس صورت میں کم حصہ بنتا ہے وہ اس کو دیا جائے باقی موقوف رکھا جائے حمل کی وضع کے بعد نئے سرے سے حساب کرکے لین دین درست کیا جائے۔ یہی فتویٰ امام محمدؒ اور حسن بن زیاد کا بھی ہے اور ہشام کے واسطے سے امام ابو یوسفؒ کا قول بھی یہی ہے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے مشہور قول بواسطہ خصاف کے مطابق (131,133) حمل کو ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کیا جائے پھر ہر دو صورتوں میں ورثاء کا جو کم سے کم حصہ بنتا ہے دیا جائے اور ان سے ضمانت لی جائے کہ اگر اصل حساب میں بعد ان کو کچھ واپس کرنا پڑے تو واپس کر دیں گے اسی پر احناف کا فتویٰ ہے۔ ان تمام صورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ ان فقہاء نے جس رائے میں زیادہ احتیاط سمجھا وہی اپنایا اور وہ یہ کہ مال ایک

لئے اکثر تجربہ ہو جاتا ہے اس لئے فقہاء نے اگر ایک طرف حمل کے حصے کو محفوظ رکھنے کا انتظام کیا ہے تو دوسری طرف باقی ورثاء کو امتحان میں ڈالنے سے بچارہے ہیں جو کہ بالکل مناسب ہے۔ امام ابو یوسفؒ البتہ اپنے مشہور قول کے مطابق اکثر ایک ہی بچہ ہونے کی حقیقت کے پیش نظر ایک لڑکا اور ایک لڑکی فرض کرتے ہیں لیکن ساتھ ضمانت کی شرط بھی لگاتے ہیں لیکن آج کل کے دور میں جب اسلامی حکومتیں نہیں ضمانت کا مسئلہ بھی بہت مشکل ہے لوگ دوسروں کا زبردستی حق لیتے ہیں اور پھر دیتے نہیں اس لئے اس علت کے پیش نظر مناسب یہی ہو گا کہ دو لڑکے اور دو لڑکیوں کو فرض کیا جائے کیونکہ اس سے زیادہ بچوں کا ہونا نادر الواقع ہے اور النادر کا المعدوم کے مطابق اس صورت میں ضمانت سے مسئلہ کو نسبتاً حل کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے حق میں زیادہ اقوال بھی ہیں جن میں جیسا کہ گزر گیا ایک قول امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی ہے۔

## خنثیٰ مشکل کا حصہ

عَنِ الشُّعْبِی: أَنَّ عَلِیّاً وَرَّثَ خُنْثٰی مِنْ حَیْثُ یَبُوْلُ۔ رَوَاہُ عَبْدَ الرَّزَاقُ حدیث رقم 9204، کذا فی "کنزالعمال"، و أَخْرَجَ عَبْدَ الرَّزَاقُ نَحْوِهِ عَنْ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیِّبِ، وَزَادَ: فَإِنْ کَانَ البُوْلُ سَوَاءً فَمِنْ حَیْثُ سَبَقَ۔ کَذَا فِی الزیلعی کتاب الخنثیٰ صفحہ 407۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اس روایت کے مطابق خنثیٰ کی میراث کو طریقہ بول کا پابند کیا کہ اگر خنثیٰ مرد کے طریقے پر پیشاب کرے تو مرد ہے اور عورت کے طریقے پر پیشاب کرے تو عورت ہے۔ اور دوسری روایت میں اس پر اتنا اضافہ ہے کہ اگر دونوں طریقے سے پیشاب کرے تو جس طریقے سے پہلے کرے۔ اگر کسی طرح بھی ان میں فیصلہ نہ ہو سکے کہ وہ مرد ہے یا عورت تو پھر وہ خنثیٰ مشکل ہے۔ یعنی یا تو اس میں آلات بول واضح پائے نہیں جاتے یا دونوں ہوتے ہیں کیونکہ ازروئے حدیث شریف "یُوَرَثُ مِنْ حَیْثُ یَبُوْلُ" (79) جس طریقے سے کوئی پیشاب کرتا ہے اس کو میراث ملتی ہے۔ حتی الوسع یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے بارے میں ایک طرف کا فیصلہ ہو جائے اس لئے اگر اس کی داڑھی آئی یا مرد کی طرح پیشاب کرتا ہے یا عورتوں کے ساتھ صحبت کرتا ہے تو مرد ہے۔ بصورت دیگر اگر اس کو حیض آیا یا اس کے پستان نکل آئے یا اس کو حمل ٹھہر گیا تو عورت ہے۔ خنثیٰ کی جنس کو متعین کرنے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ (112)، شوافع کے ایک قول (119) اور حنابلہ کے بعض اقوال (130) میں فیصلہ بول کے طریقے میں

کثرت پر نہیں بلکہ مطلقاً ایک حالت پر ہو گا۔یعنی اگر وہ مرد کی طرح پیشاب کرتا ہے تو مرد ورنہ عورت ہے اس میں اگر کبھی وہ مرد کی طرح پیشاب کرتا ہے کبھی عورت کی طرح تو وہ خنثیٰ مشکل ہو گا اور اس میں کثرت پر فیصلہ نہیں ہو گا جیسا کہ بعض کی رائے ہے۔

صاحبین 112)ؒ ، شوافع کے دوسرے قول(119) اور حنابلہ کے دوسرے قول(130) اور مالکیہ(114) کے مطابق کثرت پر فیصلہ ہو گا جس میں مالکیہ اور حنابلہ تو کسی طرح کے بھی تقابل کے قائل ہیں چاہے تعداد ہو کمیت ہو یا کیل جبکہ مالکیہ کے ایک قول میں تعداد خروج کو اعتبار ہے کمیت اور کیل کو نہیں۔اگر فیصلہ کرنا کسی وجہ سے مشکل ہو گیا تو پھر اس پر خنثیٰ مشکل کے احکامات میراث کا اجراء کیا جائے گا خنثیٰ مشکل صرف اولاد، بھائی بہن اور ان کی اولاد، پھوپھی چچا اور ان کی اولاد، ماموں خالہ اور ان کی اولاد وغیرہ میں پایا جاسکتا ہے۔زوج زوجہ، ماں باپ، جد جدہ میں اس کا پایا جانا ممکن نہیں۔ خنثیٰ مشکل کے حصے کے تعین میں علماء کرام کے چار مذاہب ہیں۔

احناف کے نزدیک خنثیٰ کو ایک دفعہ مرد تصور کر کے میراث کے حصے معلوم کیے جائیں اور ایک دفعہ عورت فرض کر کے۔ ان دونوں صورتوں میں خنثیٰ مشکل کا کم حصہ بنتا ہے وہ اس کو دیا جائے(112)۔ یہی اکثر صحابہؓ کی رائے ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ میراث شک کے زریعے نہیں حاصل کی جاسکتی اس کے لئے یقین کا حاصل کرنا ضروری ہے جیسا کہ عصبات میں باوجود کسی کے سید ہونے کے اگر کسی کے عصبات کا واضح تعین نہ ہوسکے تو باقی سادات کو اس کا حصہ بطور عصبہ بھی نہیں مل سکتا حالانکہ اس کا سید ہونا باقی سادات کا اس کے عصبات ہونے کے لئے کافی تھا لیکن اس میں چونکہ یقین لازمی ہے جو حاصل نہیں۔اسی طرح خنثیٰ کا مرد یا عورت ہونا مشکوک ہے اور ان دونوں صورتوں میں اس کا جو کم حصہ بنتا ہے وہ یقینی ہے اس لئے اس کو وہی دیا جائے گا۔شوافع کے نزدیک(134) تمام ورثاء کو جو دونوں صورتوں میں جو کم ہو گا کیونکہ یہ ان کا یقینی حصہ ہو گا دیا جائے گا اور مشکوک مال کو محفوظ کیا جائے گا جب تک خنثیٰ کا کسی طرف جھکاؤ ثابت نہ ہو جائے یا ورثاء کا آپس میں تصفیہ کسی فیصلے پر ہو جائے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یقینی حصہ سب کا دیا جائے اور مشکوک کو ورثاء کے درمیان تک روکا جائے تو یہ اقرب الی الانصاف ہے۔(135)

شعبیؒ کے نزدیک جو کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول بھی ہے خنثیٰ کے لئے نصف نصیبین بالمنازعہ ہو گا( 112 ) اسی پر مالکیہ کا فتویٰ بھی ہے، صاحبینؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اس کے مطابق خنثیٰ کو ایک دفعہ مرد فرض کر کے اور ایک دفعہ عورت فرض کر کے دونوں صورتوں میں اس کا جو حصہ بنتا ہے اس کا اوسط دیا جائے گا۔ لازمی بات ہے کہ سب ورثاء کو بھی پھر دونوں صورتوں کا اوسط حصہ ملے گا۔ مالکیہ کی دلیل یہ ہے کہ جیسا کہ دو آدمیوں کا ایک گھر پر دعویٰ ہو اور ثبوت کسی کی پاس بھی نہ ہو تو گھر ان دونوں میں برابر تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح خنثیٰ مشکل بھی مرد اور عورت کے وسط میں ہونے کی وجہ سے دونوں کا اوسط حصہ لے سکتا ہے۔ صاحبین کے درمیان پھر اوسط کے تعین میں اختلاف ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تو اوسط سہام میں ہے یعنی مرد کے لئے اگر 1 فرض کیا جائے تو عورت کا 1 /2 ہو گا اور ان کا اوسط 3 /4 ہو گا۔ امام محمدؒ اوسط سے مراد حصوں کے حساب کے بعد ان کا اوسط لیتے ہیں مثلاً ایک مرد ایک عورت اور ایک خنثیٰ ہو۔ پس اگر خنثیٰ کو مرد مان لیا جائے تو دو مرد اور ایک عورت ہوئے جس میں عورت کو 1 /5 اور مرد کو 2 /5 ملا۔ خنثیٰ کو مؤنث مان لیا جائے تو دو عورتیں اور ایک مرد ہوئے جس میں ہر عورت کو 1 /4 اور مرد کو 1 /2 ملا۔ اب خنثیٰ کا ایک صورت میں تو 2 /5 حصہ بنتا ہے اور دوسری صورت میں 1 /4 اور ان دونوں کا اوسط 13 /40 ہوا جو کہ امام محمدؒ کے نزدیک خنثیٰ کا اس صورت میں حصہ بنتا ہے۔ اس صورت میں مرد کا 18 /40 اور عورت کا 9 /40 بنتا ہے جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مرد کے اگر 4 حصے فرض کیے جائیں تو عورت کے 2 حصے ہو جائیں گے اور خنثیٰ کے 3 اور ان کا مجموعہ 9 بن گیا جس میں خنثیٰ کے 3 حصے ہیں گویا کہ 3 /9 یا 1 /3 پس اس مثال میں صاحبین کے حصوں کے درمیان فرق 1 /120 ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا اصول للذکر مثل حظ الانثیین کی طرح واضح ہے اس لئے آسان ہے جبکہ امام محمدؒ کے اصول کے مطابق مسئلہ کو دو دفعہ حل کر کے خنثیٰ کے لئے ان کا اوسط معلوم کیا جائے گا۔

چوتھا قول حنابلہ کا ہے اور یہ شوافع اور مالکیہ کا اقترانی قول ہے کہ خنثیٰ مشکل کی صورت میں تمام ورثاء کو دونوں صورتوں میں کم والا حصہ دیا جائے اور مشکوک مال خنثیٰ کی وضاحت تک موقوف رکھا جائے۔ اگر وضاحت نہ ہو سکی اور یہ خنثیٰ مشکل بن گیا تو پھر مالکیہ کے قول پر عمل کیا جائے۔

# مرگ انبوہ

حَدَّثْنَایَحْیٰی بْنُ حَسَّانَ حَدَّثْنَا ابْنُ زِیَادٍ عَنْ اَبِیهِ عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَیْدٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ

کُلُّقَوْمٍ مُتَوَارِثِیْنَ عَمِیَ مَوْتُهُمْ فِی هَدْمٍ اَوْ غَرَقٍ فَاِنَّهُمْ لَایَتَوَارَثُونَ یَرِثُهُمُ الاَحْیَاءُ رواہ دارمی حدیث رقم 3044

باب میراث الغرقی

اَخْبَرْنَا جَعْفَرُ بْنُ عَوْنٍ ابْنِ اَبِی لَیْلٰی عَنِ الشَّعْبِیِّ اَنَّ بَیْتاً بِشَّامٍ وَقَعَ عَلٰی قَوْمٍ فَوَرَّثَ عُمَرُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ

رَوَاہُ دَارْمِی

حَدَّثْنَا اَبُو نُعَیْمٍ حَدَّثْنَا سُفْیَانُ عَنْ حُرَیْشٍ عَنْ اَبِیهِ عَنْ عَلِیٍّ اَنَّه ▪ وَرَّثَ اَخَوَیْنِ قُتِلاَ بِصِفِّینَ اَحَدَهُمَا

مِنَاالآخَرِ رَوَہُ دَارْمِی

حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِیعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ غَیْرِوَاحِدٍ مِنْ عُلُمَائِهِمْ اَنَّ ▪ ہ ▪ لَمْ یَتَوَارَثْ

مَنْ قُتِلَ یَوْمَ الْجَمَلِ وَیَوْمَ صِفِّینَ وَیَوْمَ الحَرَّةِ ثُمَّ کَانَ یَوْمَ قُدَیْدٍ فَلَمْ یُوَرَّثْ اَحَدٌ مِنْصَاحِبِه ▪ شَیْأً اِلاَّ مَنْ

عُلِمَ اَنَّه ▪ قُتِلَ قَبْلَ صَاحِبِهِ (مَوطا امام مالك)

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے اگر کئی لوگوں کی ایک جماعت ایک وقت میں کسی مکان کے نیچے آنے کی وجہ سے یاڈوب جانے سے (کسی بھی ناگہانی حادثہ میں) اکٹھی مر جائے اور ان میں اگر کئی لوگوں کی ایک جماعت ایک وقت میں کسی مکان کے نیچے آنے کی وجہ سے یاڈوب جانے سے (کسی بھی ناگہانی حادثہ میں) اکٹھی مر جائے اور ان میں اس کا پتہ نہ لگ سکے کہ کون پہلے مرا ہے اور کون بعد میں ( اس کو مرگ انبوہ کہتے

ہیں) تو ایسی حالت میں مرحومین آپس میں ایک دوسرے سے میراث نہیں لیں گے اور ان مرحومین سے جو زندہ ہیں وہ میراث پائیں گے۔

دوسری روایت میں شعبیؒ روایت کرتے ہیں کہ شام میں کچھ لوگ مکان کے نیچے آگئے تو عمر نے ان میں میراث ایک دوسرے کو دلوادی تھی۔ تیسری روایت میں حریش سے روایت کی گئی ہے کہ علیؓ نے صفین میں مقتولین میں ایک کو دوسرے سے میراث دلوائی تھی۔ چوتھی روایت میں امام مالکؒ ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن سے کئی ل علماء کی روایت نقل کرتے ہیں کہ جمل صفین اور حرہ کے مقعہ پر مقتولین میں ایک کی میراث اس وقت تک دوسرے کو نہیں دی گئی جب تک یہ پتہ نہ چلا کہ کون پہلے فوت ہوا اور کون بعد میں۔

بظاہر ان روایات میں تضاد پایا جاتا ہے اس لئے اس بات پر کہ مرحومین کی میراث آپس میں بھی تقسیم ہو گی یا نہیں؟ علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت کی طرف یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ اس بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ ان میں سے مرحومین ایک دوسرے سے میراث لیں گے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا نام لیا جاتا ہے (112,130) کیونکہ ایک روایت کے مطابق جب شام میں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی تو آپ نے مرحومین کا ایک دوسرے سے میراث لینے کا حکم جاری فرمایا تھا( اَنَّ عُمَرَ وَرَّثَ اَھْلَ طَاعُوْنِ عَمْوَاسٍ بَعْضُھُمْ مِنْ بَعْضٍ)۔ اس پر حنابلہ کی ایک جماعت کا بھی فتویٰ ہے۔ اس کا طریقہ ے وہ یہ بتاتے ہیں کہ پہلے ایک میت فرض کرکے دوسروں کو زندہ فرض کرکے میراث تقسیم ہو گی اور پھر دوسرے کو میت اور باقی سب کو زندہ فرض کرکے میراث کی تقسیم ہو گی اس طرح سب کے ساتھ کیا جائے۔ حساب میں آسانی کے لئے ان لوگوں کو زندہ نہیں شمار کیا جائے جس کا میت وارث ہو اور میت کے وہ وارث ہوں کہ اس صورت میں حساب کا کوئی فائدہ نہیں۔

صحابہؓ کی دوسری جماعت جن میں حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضنت عبد اللہ بن عباسؓ اور زید بن ثابتؓ شامل ہیں ان کے نزدیک مرحومین ایک دوسرے سے میراث نہیں لیں گے (118) یعنی یہ سمجھا جائے گا کہ وہ موجود ہی نہیں تھے صرف زندہ ہی مردوں سے میراث لیں گے۔ اس پر آئمہ ثلاثہ مالکیہ (114)، شافعیہ (113)، حنفیہ (112) اور حنابلہ کی ایک جماعت (120) کا فتویٰ ہے گویا کہ اس قول پر بعد میں تقریباً اجماع ہو چکا ہے۔ س لئے جمہور کی رائے یہی ہے۔ بعض شوافع نے اس میں یہ تفصیل کی ہے کہ اگر کسی کو مرحومین میں

یہ تو پتہ لگا ہو کہ ان میں بعض پہلے مرے اور بعض بعد میں، لیکن بھول جانے کی وجہ سے تعین نہ کر سکے تو اس صورت میں از روئے احتیاط تقسیم کو قضیئے کی وضاحت تک مؤخر کیا جائے اور یہی بعض احناف کی بھی اس قسم کی صورت میں رائے ہے راقم کی رائے میں اگر اس وقت دونوں اقوال پر عمل کرتے ہوئے یقینی حصوں کی تقسیم کے بعد صرف مشکوک ترکہ کو محفوظ رکھا جائے تو تقسیم میں تاخیر سے ورثاء کو جو نقصان ہو سکتا ہے وہ کم ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

پہلے قول کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مرحومین کی حیات ثابت ہے اس لئے اصل یہی ہے کہ جب تک یہ پتہ نہ لگے کہ وہ اپنے مورث سے پہلے مرا ہے یوں سمجھا جائے گا کہ وہ اس وقت زندہ تھا جس وقت اس کا مورث مر رہا تھا اور ان کی طرف سے جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں ان میں ان میں چند ایک یہ ہیں۔ بیہقیؒ کہتے ہیں کہ شعبیؒ حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں "کہ حضرت عمرؓ نے بعض کا ترکہ بعض کو دے دیا تھا "(80) اور قتادہؒ کی روایت میں بھی " حضرت عمرؓ نے طاعون عمواس میں ترکے ایک دوسرے میں تقسیم کئے۔" (81) اور بعض حضرات ایاسؒ بن عبد اللہ المزنی کی روایت "کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اس قوم میں جن پر گھر گر گیا تھا تقسیم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مردے ایک دوسرے سے لیں گے" اسے بھی دلیل پکڑتے ہیں۔

دوسرے قول یعنی مرگ انبوہ میں اموات کا اموات سے میراث نہ لینے کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ میراث کسی کے مرنے کے بعد ہی ملتی ہے اور یہاں پر اس بات کا یقین ہی حاصل نہیں بلکہ اس میں شک ہے اور شک کے زریعے کوئی وارث نہیں ہوتا اس لئے مرحومین ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ اور ان کی طرف سے بیہقی کی ابی زناد کی طریق پر تخریج شدہ روایت خارجہ بن زید کی پیش کی جاتی ہے جو وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں: "مجھے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اہل یمامہ کے قتل کے بعد ان کے مردوں سے زندوں کو میراث دینے کا حکم فرمایا اور مردوں میں ایک کو دوسرے سے نہ دلوانے کا" (82) اور ان ہی اسناد سے ان کی دوسری روایت کہ: " طاعون عمواس کے موقع پر ایک قبیلہ میں اموات ہوئی تھیں تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ان میں زندوں کو مردوں سے میراث دلواؤں اور مردوں میں ایک دوسرے کو نہیں۔(83)" بھی ان ان کا مستدل ہے۔ اس طرح بیہقی کی روایت کہ: " واقعہ حرہ میں جب لوگوں پر مصیبت پڑی

تو ان کے ہاں فیصلے حضرت زیدؓ بن ثابت کے مسلک پر ہوتے تھے (84)"۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔(85)۔اس موضوع کی ابتدا میں مذکورہ پہلی روایت: " اگر کئی لوگوں کی ایک جماعت ایک وقت میں کسی مکان کے نیچے آنے کی وجہ سے یا ڈوب جانے سے (کسی بھی ناگہانی حادثہ میں ) اکٹھی مر جائے اور ان میں اس کا پتہ نہ لگ سکے کہ کون پہلے مرا ہے اور کون بعد میں ( اس کو مرگ انبوہ کہتے ہیں)تو ایسی حالت میں مرحومین آپس میں ایک دوسرے سے میراث نہیں لیں گے اور ان مرحومین سے جو زندہ ہیں وہ میراث پائیں گے " بھی پیش کی جاتی ہے اور اسطرح موٴطا امام مالک کی روایت جو موضوع کی ابتدا کی چوتھی روایت ہے کہ: "جمل ، صفین حرہ اور قدید کے موقعہ پر اس وقت تک کسی مردے کی میراث کسی دوسرے مردے کو نہیں دلوائی جب تک یہ پتہ نہ چلا کہ کون پہلے مرا تھا اور کون بعد میں" تو تقریباً قول فیصل ہے۔اس تمام تفصیل سے یہ پتہ چلا کہ جنگ صفین، یوم الحرۃ اور جنگ جمل میں دوسرے قول پر ہی عمل ہوا تھا حالانکہ اس وقت صحابہؓ کی کثیر جماعت موجود تھی اب پہلے قول کے حق میں جو روایات ہیں ان کی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے مرحومین میں سے اموات آگے پیچھے ہوئے ہوں اور اس وجہ سے ایک نے دوسرے سے میراث لی ہو اور راوی نے تفصیل نہ بیان کی ہو جس سے سہو ہوا ہو کہ آپس میں تقدیم و تاخیر نہ ہونے کے باوجود ان میں سے مرحومین نے ایک دوسرے کی میراث پائی ہو لیکن دوسرے قول کے بارے میں جو روایات ہیں ان کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جاسکتی جس میں مرحومین میں آپس میں توارث کی نفی کی گئی ہے۔ دوسری طرف قول اول کے مطابق شعبیؒ اور قتادہ کی ان روایتوں میں جو مرحومین میں آپس میں توارث کے بارے میں ہیں، انقطاع پایا جاتا ہے۔اور اباس بن عبد اللہ المزنی کی روایت " وَيَرِثُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً"(86) میں جس کی نسبت رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف کی جاتی ہے کے بارے میں خود الموفق " المغنی " میں فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مجیب خود اباس بن عبد اللہ المزنی ہے رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہیں۔اور ایسا ہی سعید نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے جس سے امام احمد بن حنبلؒ نے روایت کیا۔اس لئے اس بات کا اخذ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ مرگ انبوہ میں مرحومین ایک دوسرے سے میراث نہیں لے سکتے تبھی تو تین امام اس طرف گئے ہیں اور حنابلہ کی بھی ایک جماعت ان کے ساتھ ہے۔

## قیدی کی میراث

كَانَ شُرَيْحٌ يُوَرِّثُ الأَسِيرَ فِي أَيْدِي الْعَدُوِّ وَيَقُولُ هُوَ أَحْوَجُ إِلَيْهِ وَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ أَجِزْ وَصِيَّةَ الأَسِيرِ وَعَتَاقَهُ وَمَا صَنَعَ فِي مَالِهِ مَا لَمْ يَتَغَيَّرْ عَنْ دِينِهِ فَإِنَّمَا هُوَ مَالُهُ يَصْنَعُ فِيهِ مَا يَشَاءُ رواہ البخاری حدیث رقم 6380 باب میراث الاسیر۔

أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ حَسَّانَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي الزِّنَادِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْعَزِيزِ فِي امْرَأَةِ الأَسِيرِ أَنَّهَا تَرِثُهُ وَيَرِثُهَا رواہ الدارمی حدیث رقم 3090۔

حَدَّثَنَا الْمُعَلَّى بْنُ أَسَدٍ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ عَنْ دَاوُدَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ أَنَّهُ كَانَ لاَ يُوَرِّثُ الأَسِيرَ رواہ الدارمی حدیث رقم 3094۔

پہلی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی شریح اسیر کو دشمن کی قید میں ہوتے ہوئے میراث دلواتے تھے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے نزدیک اسیر کی وصیت، عتاق اور اپنے مال میں تصرف جائز ہے۔ دوسری روایت میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اسیر کی بیوی کو اس کا میراث دینے اور اس کی میراث اس کی بیوی کو دینے کے قائل نظر آتے ہیں۔ تیسری روایت میں حضرت ابراھیمؒ اسیر کو میراث دلواتے ہیں چوتھی روایت میں سعید بن المسیب اسیر کو میراث نہیں دلواتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مطابق اسیر کو اس کا زوجہ میراث دے سکتی ہے اور اس سے لے سکتی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ مسلمان دارالحرب میں امان کے ساتھ یا بغیر امان کے داخل ہو تو اس سے میراث پر فرق نہیں پڑتا۔ یہی احناف کا مسلک ہے اور یہی جمہور کی رائے ہے۔

السراجی کے مطابق اسیر عام مسلمانوں کی طرح ہے اگر اس کی حیات معلوم ہے جب تک وہ اپنے دین پر قائم ہے، خدانخواستہ مرتد ہو گیا تو اس کا حکم مرتد کا ہو جائے گا اور اگر اس کے ارتداد یا حیات کا پتہ نہ ہو تو پھر اس کا حکم مفقود الخبر کا ہو جائے گا۔ الموفق بھی "المغنی" میں لکھتے ہیں کہ اس کا حکم مفقود کا ہے اگر اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ اگر حیات معلوم ہو تو جمہور کی رائے میں اس کا حکم عام مسلمانوں کا ہے امام مالکؒ اسیر کی مال کو اس کی موت تک یا اس کے حکم ارتداد تک موقف رکھتے ہیں لیکن سعید بن المسیب کے نزدیک وہ میراث نہیں پاسکتا کیونکہ وہ غلام ہے یہی وہ نخعی اور قتادہ سے روایت کرتا ہے لیکن جمہور کی رائے زیادہ معقول ہے کیونکہ کفار مسلمانوں کو غلام (شرعاً غلام) نہیں بنا سکتے۔۔ واللہ اعلم۔

مرتد کی میراث

حَدَّثَنَا الحَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ حَدَّثَنَا اَبُو عَوَانَةَ عَنِ الاَعْمَشِ عَنْ اَبِی عُمَرَوَ الشَّیْبَانِی اَنَّ عَلِیّ بْنُ اَبِی طَالِبِ جَعَلَ الْمِیْرَاثَ الْمُرْتَدِّ لِوَرَثَةِ الْمُسْلِمِیْنِ رواہ الدارمی حدیث رقم 3075)

عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ ،قَالَ : بَعَثَنِی أَبُوبَکْرٍ عِنْدَ رُجُوعِهِ اِلٰی اَهْلِ الرِّدَّةِ أَنَّ اَقْسَمَ أَمْوَالِهِمْ بَیْنَ الْوَرَثَةِ الْمُسْلِمِیْنُ۔ رواہ فی ''المغنی'' ولم اوقف علی سند۔

پہلی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کو دی دوسری روایت میں بھی حضرت ابو بکرؓ نے مرتدین کی میراث ان کے مسلمان ورثاء میں تقسیم کی۔بظاہر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرتدین کی میراث مسلمان ورثاء کو ملنی چاہیئے اور یہی صاحبین کی رائے

ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔آپ کے نزدیک اگر مرتد ارتداد کی حالت میں مر جائے یا دارالحرب کے ساتھ اس کا الحاق ہو جائے تو جو مال اس نے حالت اسلام میں کمایا ہے اس کو مسلمان ورثہ میں تقسیم کرنا چاہیئے اور جو مال اس نے حالت ارتداد میں کمایا ہے اس کو بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے کیونکہ ارتداد کے وقت وہ مسلمان تھا اور ارتداد کے بعد ایسا ہوا جیسا کہ مر گیا پس ارتداد سے پہلے اس کا وہ مال جو اس نے حالت اسلام میں کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کو ملنا چاہئے اور جو مال اس نے حالت ارتداد میں کمایا ہے اس وقت چونکہ وہ کافر تھا اس لئے وہ مال فئی ہے کیونکہ نہ وہ مسلمان لے سکتا ہے نہ کافر اس لئے اس کو بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔صاحبین کے نزدیک اس کی ارتداد سے اس کی میراث پر کوئی اثر نہیں پڑا سوائے اس کے کہ ارتداد کے بعد اس کو مردہ سمجھا گیا۔امام شافعیؒ،امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک دونوں قسم کا مال بیت المال میں جمع کیا جائے گا گویا کہ وہ ان کو دونوں حالتوں میں کافر سمجھ رہے ہیں۔عقلاً امام ابو حنیفہؒ کی دلیل بہت وزنی دکھائی دیتی ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں فرق تو ہے صاحبین نے اس کو دونوں حالت میں جب مسلمان سمجھ لیا یہ اگر واقع کے مطابق نہیں معلوم ہوتا تو آئمہ ثلاثہ کا اس کے ساتھ دونوں حالتوں میں کافر کا برتاؤ بھی امر واقع کی خلاف معلوم ہورہا ہے۔واللہ اعلم۔البتہ اس پر کہ مرتد ہونا مرنے کے برابر ہے اس پر سب کا تفاق ہے اس لئے سب کے نزدیک مرتد کسی سے میراث نہیں پاسکتا کیونکہ جو مر گیا وہ کسی سے میراث کیسے لے سکتا ہے۔صرف حنابلہ کے ہاں وہ اس وقت ترغیباً مسلمان کی میراث پاسکتا ہے جب وہ

میراث کی تقسیم سے پہلے مسلمان ہو چکا ہو۔۔ اور جو مال اس نے دار لحرب کے ساتھ الحاق کے بعد کمایا ہے اجماعی طور پر وہ مال فئی یعنی ضائع شدہ مال کا ہے اس لئے اس کو بیت المال میں رکھا جائے گا۔ جہاں تک مندرجہ بالا آثار کا تعلق ہے تو اس کی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ مرتد جب ارتداد کے بعد فوراً قتل کیا گیا تو ان کو ارتداد کے بعد مال کمانے کا تو موقعہ ہی نہیں ملا یا وہ معلوم نہ ہوا تو اس کا باقی مال تو وہی ہے جو اس نے حالت اسلام میں کمالیا وہ مسلمان ورثہ کو ہی دیا جائے گا۔ البتہ جو حضرات دونوں صورتوں میں اس کو بیت المال میں جمع کرتے ہیں ان کے اس کا جواب ہنوز ابھی باقی ہے۔

مرتدہ کا مال بالاتفاق سارا مسلمان ورثہ کو ملے گا اور اس کو مرتد پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مرتد کے بارے میں تو حکم ہے " من بدل دینہ فاقتلہ " اور عورت کو ارتداد کی وجہ سے قتل نہیں کیا جاتا جبکہ عبد اللہ بن عمرؓ سے بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ ﴿رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے (87) ﴾ مرتد کسی کی میراث نہیں لے سکتا نہ مسلمانوں کی نہ اپنے جیسے مرتدین کی۔ یہی حکم اس باب میں مرتد کا ہے۔ اگر سب لوگ نعوذ باللہ مرتد ہو جائیں تو وہ ایک دوسرے کے میراث لیں گے ۔ مرتد کے مال سے اس کے دیون بالاتفاق ادا کیے جائیں گے۔ (السراجی) ۔

## تخارج

رُوِیَ عَبْدَ الرَّزَّاق عن ابن عینیة عن عمرو بن دینار أن امراة عبد الرحمٰن ▪ بن عوف اخرجها اهله من ثلث الثمن بثلاثة و ثمانین الف درهم فی قصة الاصبخ بن عمود الکلبی بدومة الجندل و انه اسلم لما عزاه عبد الرحمٰن ابن عوف فی حیٰوة النبی ﷺ نکت النبی ﷺ ان یتزوج تماضر بنت الاصبخ فتزوجها و هی ام ابی سلمة بن عبد الرحمٰن روی ذاك واقدی و عنه ابن سعد فی الطبقات ثم روی عنه باسناد آخر عن صالح بن ابراهیم بن عبد الرحمٰن بن عوف قال اصاب تماضر بنت الاصبخ ربع الثمن فأخرجت بمأة الف و روی ابن سعد عن ابی نعیم عن کامل ابی العلا عن ابی صك قال مات عبد الرحمٰن عن ثلث نسوة فاصاب کل واحدة ما ترك ثلاثه الفاً و من طریق ایوب عن محمد ان عبد الرحمٰن

توفی و کان فیھما ترک اربع نسوۃ و ترک رھباً قطع باغنوس حتیٰ تجلت ایدی الرجال فاأخرجت منھن امرۃ عثمان من ثمنھا بثمانین الفاً۔ الھدایہ

مندرجہ بالا اثر سے یہ واضح ہے کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی بیوی نے اپنے حصے سے مصالحت کر دی تھی چونکہ یہ واقعہ صحابہؓ کے سامنے ہوا تھا اور کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمایا تھا تو اس پر اجماع ثابت ہو گیا۔ پس اب اگر کوئی وارث دوسرے حصہ داروں کے ساتھ کسی باہمی مصالحت کی بنیاد پر اپنے حصے سے دستبردار ہونا چاہتا ہے تو ہو سکتا ہے۔ اس کو تخارج کہتے ہیں اور یہ خرج یخرج سے باب تفاعل سے ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب کے حصوں کا جو مجموعہ بنتا ہے اس سے اس شخص کے حصے نکال دیے جائیں اور باقی سب کے حصے اتنے ہی رہیں گے جتنے ہیں مثلاً ایک شخص تین بیٹیاں، ایک بیوی اور ماں باپ چھوڑ مرا۔ حساب سے معلوم ہوا کہ بیوی کو 9، ہر بیٹی کو 16، ماں کو 12 اور باپ کو بھی 12 حصے ملیں گے۔ ان سب کے حصوں کا مجموعہ 81 آتا ہے اب اگر بیوی مکان کے بدلے جس میں رہتی ہے اپنے حصے سے دستبردار ہوتی ہے اور باقی ورثاء اس پر راضی ہیں تو یہ جائز ہے اور اب کل مجموعے سے اس کے حصے جو کہ 9 سہام ہیں تفریق کریں گے تو 72 باقی بچیں گے پس اب اگر باقی جائیداد کے 72 حصے کیے جائیں گے تو اس میں ہر بیٹی کو 16 اور ماں باپ میں ہر ایک کو 12 حصّے ملیں گے اگر تخارج نہ کیا جاتا تو کل جائیداد کے 81 حصے کیے جاتے اور اس میں بیوی کو 9 اور باقی کو اتنے ہی ملتے جتنے کہ اب مل رہے ہیں۔

## حق وراثت سے دست برداری

اگر کوئی ایسا شخص جس کو میت کی جائیداد میں سے شرعی طور پر حصہ لینے کا حق پہنچتا ہو (مثلاً بہن، بھائی، ماں، نانی وغیرہ) یہ کہہ کر حصہ لینے سے انکار کرے کہ میں خوشی سے اپنا حصہ چھوڑتا / چھوڑتی ہوں باقی وارث ساری جائیداد آپس میں بانٹ لیں یا یہ کہ میرا حصہ اپنے طور پر کہیں بطور چندہ وغیرہ دے دیں۔ تو اس بخشش کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ وارث اپنے حصے پر باقاعدہ قبضہ حاصل کرلے۔ مثلاً اگر زمین ہے تو قبضہ اور تقسیم کے بعد بذریعہ رجسٹری انتقال کروالے۔ پھر اس کے بعد جس کو چاہے اسے واپس منتقل کردے یا بطور چندہ دے کیونکہ اس سے بعض اوقات مختلف قانونی پیچیدگیوں کے علاوہ معاشرتی دباؤ کا ناجائز استعمال بھی ہو جاتا ہے مثلاً بعض علاقوں میں بھائی بہنوں کو ان کا شرعی حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو عورتیں کمزور

ہونے کی وجہ سے اپنا حصہ نہیں مانگ سکتیں اور اگر کوئی مانگے تو اس کو معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان بیچاریوں پر معاشرتی دباؤ کو کم کرنے کی خاطر مجوزہ طریقہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اگر ایک دفعہ کوئی اپنا مال قبضہ کرلے تو پھر ان سے آسانی کے ساتھ واپس نہیں لیا جاسکتا الا کہ وہ خود واپس کرنے پر تلا ہوا ہو اور آج کل کی مادیت کے دور میں بہنوں سے اتنی قربانی کی توقع کرنا خلاف عقل ہے اور ان کی رضامندی فی الاصل شرما شرمی ہوتی ہے جس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ اگر کوئی کسی کا مال بغیر اس کی حقیقی رضامندی کے اس طرح حاصل کرے تو اس کو معاشرتی ڈاکہ کہا جاسکتا ہے جس سے بچنا از حد ضروری ہے۔

اگر شرعی تقاضوں کے مطابق کوئی اپنے حصے سے دستبردار ہونا چاہتا ہے تو ہوسکتا ہے مثلاً کسی کو مورث کے مال میں شبہ ہو اور وہ اس میں سے حصہ نہ لینا چاہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے اور یہ تخارج ہی کی ایک صورت ہے فرق صرف یہ ہے کہ تخارج میں تو کسی لین دین پر اپنے حصے سے دستبرداری ہوتی ہے اور یہاں لین دین کچھ نہیں ہوتا البتہ ایسے شخص کو ابتدا میں حساب میں شامل ضرور کرنا چاہیے کیونکہ اگر حساب میں شامل نہیں کیا جاتا تو دوسروں کے حصوں کی نوعیت بدل سکتی ہے مثلاً میت کی دو بیٹیاں، ایک بیٹا، ماں اور ایک بہن ہے اب بیٹا اگر تخارج کرنا چاہے یا ویسے حصے سے دستبردار ہونا چاہے تو اگر اس کو حساب میں شامل نہیں کیا جاتا تو بیٹیاں ذوی الفروض بنتی ہیں اور بہن کو بھی ایک سدس بطور عصبہ ملے گا لیکن اگر بیٹے کو حساب میں شامل کیا جائے تو بیٹیاں اس کے ساتھ عصبہ ہو کر بہن کو محروم کردیں گی۔

## حجب حرمان

حجب کی دو قسمیں ہیں ایک کو حجب نقصان کہتے ہیں یعنی اس حجب کے ذریعے کسی کا حصہ ختم نہیں ہوتا لیکن اس میں پہلے کمی آجاتی ہے مثلاً میت کی اولاد کی موجودگی میں میت کی ماں کا یا میت کی زوجہ کا حصہ نصف رہ جاتا ہے اور دوسرا حجب حرمان کہلاتا ہے جس میں اس کی وجہ سے کوئی اپنے حصے سے مکمل محروم ہوتا ہے مثلاً بیٹا حاجب ہے پوتے کے لئے۔ اس لئے اگر بیٹا موجود ہو تو پوتے کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ حجب نقصان میاں بیوی پوتی اور علاتی بہن کا ہوسکتا ہے جبکہ حجب حرمان کا اصول "الاقرب فالاقرب"

ہو چکا اس لئے جب قریب موجود ہو تو بعید محروم ہو جاتا ہے اس جس کا میت کے ساتھ کسی واسطہ کے ساتھ رشتہ ہو تو اس کو حصہ ملتا ہے۔ کچھ رشتہ دار ایسے ہیں جو کبھی محروم نہیں ہوتے اور ان کی تعداد چھ ہے۔ ان میں بیٹا، باپ، میاں، بیوی اور ماں بیٹی شامل ہیں۔ محروم صاحب سراجی کے نزدیک کسی کے لئے حاجب نہیں بن سکتا لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک حاجب نقصان بن سکتا ہے جیسے کافر قاتل غلام۔ اس طرح دو بھائی / بہن یا اس سے زائد جس جہت سے بھی ہوں گو کہ باپ کے ساتھ میراث نہیں پاتے لیکن ماں کا حصہ تہائی سے چھٹا کر دیتے ہیں۔

## میراث ابن الملاعنہ

عن الشعبی: أن علیاً قال فی ابن الملاعنه ترک اخاه: لأمه الثلث، ولأخیه السدس، و ما بقی فهو رد علیهما بحساب ما ورثا۔ و قال عبد الله: للأخ السدس، و ما بقی فلأُمِّهِ و هی عصبة۔ و قال زید: لأمه السدس، ولأخیه السدس، و ما بقی ففی بیت المال۔ رواه سعید بن منصور والبیهقی، ''(کنزالعمال'' باب میراث ابن الملاعنه جلد6صفحه 258)

یہ روایت ابن الملاعنہ کے ترکے کے بارے میں تین اکابر صحابہؓ کے مسلک کو ظاہر کر رہا ہے۔ ابن الملاعنہ کا ترکہ اس کے اخیافی بھائی اور اسکی ماں میں کیسے تقسیم کیا جائے تو اس کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ اس کی ماں کو ثلث دے دو اور اس کے بھائی کو سدس اور جو باقی بچے وہ ان دونوں پر رد کر دو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بھائی کو سدس دے دو اور باقی اس کے ماں کا ہے کیونکہ آپؓ کے نزدیک ابن الملاعنہ کی ماں اس کا عصبہ ہے۔ حضرت زیدؓ کے نزدیک اس کی ماں کو ثلث دیا جائے گا اور اس کے بھائی کو سدس اور باقی کو بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

اگر ابن الملاعنہ کی ماں یا ماں کے عصبات کو اس کا حقیقی عصبہ بنایا جاتا ہے تو قرآن کے ساتھ تعارض لازم آتا ہے لیکن شعبیؒ کی اس روایت جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ " ماں ابن الملاعنہ کی عصبہ ہے اور اس کا پورا مال لیتی ہے اور اگر اس کی ماں نہ ہو تو ماں کے عصبات اس کے عصبات ہیں " (95) بھی لائق غور ہیں۔ برخلاف اس کے اول الذکر روایت میں حضرت علیؓ ابن الملاعنہ کی ماں کو عصبہ نہیں بنا رہا ہے بلکہ اس کو اس کا فرض یعنی ثلث دے کر اور اخیافی بھائی کو اس کا فرض سدس دے کر ما بقی کو ان

دونوں پر رد کرتے ہیں۔ اس طرح اول الذکر روایت میں حضرت زیدؓ بھی ابن الملاعنہ کی ماں یا اس کے عصبات کو عصبہ حقیقی نہیں بنا رہا ہے بلکہ ان دونوں کو ان کا فرض حصّہ دے کر بقیہ مال کو بیت المال میں جمع کراتا ہے۔ اس طرح اس مسئلے میں حضرت علیؓ اور حضرت حضرت زیدؓ میں اتفاق پایا جاتا ہے کیونکہ رد کے بارے میں ان میں اختلاف صرف اس مسئلے میں نہیں بلکہ پہلے سے ہے۔ اس طرح ان دونوں اکابر میں اس مسئلے کی اصل پر کوئی اختلاف نہیں پایا گیا۔ اب اگر حاکمؒ کی ابن عباس والی روایت کہ حضرت علی نے ابن الملاعنہ کی ماں کو اس کی میراث دی اور اس کو اس کا عصبہ بنایا( 95) اور حاکم کی وہ روایت جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ابن الملاعنہ کے بیٹے کے بارے میں عصبتہ امہ فرمایا( 96) کی اگر تطبیق کی جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ علمائے احناف نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ ان اقوال میں جن میں ابن الملاعنہ کی ماں یا اس کے عصبات کو اس کا عصبہ فرمایا گیا ہے کو مجاز پر محمول کیا ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کا وارث اس کی ماں اور اس کی قوم ہے نہ کہ اس کا باپ اور اس کی قوم کیونکہ باپ سے تو اس کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ پس احناف نے اصل مسئلہ یعنی ابن الملاعنہ کی ماں اور ماں کے عصبات کو اس کا عصبہ حقیقی نہ ٹھہرانے میں تو حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کا مشترکہ مسلک اختیار فرمایا تاہم رد کے مسئلے میں چونکہ احناف کا پہلے سے مسلک عام صحابہؓ کی متابعت میں حضرت زیدؓ کے اتباع کا نہیں ہے اس لئے اس جزو میں حضرت زیدؓ کے تحقیق پر عمل نہیں ہے۔ اب ایک روایت کا تصفیہ بھی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت تین میراث لیتی ہیں۔ اس کی لقیط (اس کے مجھول النسب پالے ہوئے بچے )، عتیق (اس کا آزاد کردہ) اور وہ جن پر ملاعنت اس نے کی ہے(97) ۔ اس کی تطبیق یوں ہے کہ لقیط کا حصّہ وہ بطور تبرع لیتی ہے، اپنے عتیق کا حصّہ بطور عصبہ لیتی ہے اور اپنے ابن الملاعنہ بچے کی بطور فرض اور پھر رد کے طور پر لیتی ہے۔

ابن القدامہ حنبلی "المغنی" میں جب یہ فرماتے ہیں کہ اگر ابن الملاعنہ کی ماں اور اس کا خال باقی ہوں تو ثلث اس کی ماں کو دیا جائے گا اور باقی اس کے خال کو۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ بلاشبہ ایک عجیب تحقیق ہے کیونکہ خال ویسے تو ذوی الارحام میں سے ہے اس کو عصبہ بنانے کے لیئے اس کو اگر عم فرض کرتے ہیں تو ماں کو باپ فرض کرنا پڑے گا۔ باپ اگر موجود ہو تو عم کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ لیکن اگر ان کی مسلک کو سمجھا جائے تو بات عجیب نہیں لگے گی یہ الگ بات ہے کہ فروع میں ان کے ساتھ اختلاف کیا جائے۔۔ ابن قدامہ نے

اس میں احمدؒ سے دو روایتیں نقل کی ہیں ایک " عصبتہ عصبۃ امہ " یعنی اس کے عصبات اس کی ماں کے عصبات ہیں۔ اس کو الخرقی نے اختیار کیا ہے اور اس کو علی، ابن عباس، ابن عمر رضی اللہ عنھم سے روایت کرتے ہیں جس کی طرف حن، ابن سیرین، جابر بن زید، عطاء، شعبی، حکم، حماد، ثوری اور حسن بن صالح رحمھم اللہ گئے ہیں ۔ دوسری روایت " أن امہ عصبۃ فإن لم تکن عصبۃ فعصبتھا عصبۃ" کہ اس کی ماں اس کی عصبہ ہے اور اگر اس کی ماں نہ ہو تو اس کی ماں کے عصبات اس کے عصبہ ہیں۔ اس کو وہ روایت کرتے ہیں علیؓ سے، مکحول اور شعبی رحمھم اللہ سے۔ اور واثلہؓ کی روایت جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت کو تین میراثوں کو لینے والا فرمایا ہے، اس کی عتیق کی، لقیط کی اور ابن املاعنہ بچے کی (97) ۔ اس کے ذریعے ماں باپ کی قائمقام ہو سکتی ہے نہ کہ پہلی روایت کے مطابق۔ پس احمدؒ کی پہلی روایت کے مطابق ماں کو ثلث ملے گا اور خال کو باقی سارا کیونکہ ماں اس روایت میں عصبہ نہیں لیکن خال عصبہ ہے جبکہ اس کی دوسری روایت کے مطابق اس کی ماں کو کل کا کل ملے گا کیونکہ وہی اس کی عصبہ ہے یعنی اس کے لئے بمنزلہ باپ کے ہے۔ بیہقی نے البتہ اس روایت کو جس میں ابن املاعنہ کے ماں کے عصبات اس کے عصبات ہے (96) کو منقطع بتایا ہے۔

احناف نے ان روایات کی تو تطبیق کی ہے کہ ان سب کو خبر واحد ہونے کی وجہ سے نص کے مقابلے میں قابل استدلال نہیں سمجھا ہے۔ کیونکہ جتنا محتاط راستہ ہو وہی بہتر ہے پس اگر نص پر عمل ہو اور حدیث کی اس کے ساتھ تطبیق سمجھ میں آجائے تو اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے۔

اس طرح تحرز المرءۃ ثلٰثۃ مواریث میں تحرز ہے جس کے لئے ماں کا عصبہ ہونا ضروری نہیں بلکہ مال کا کسی ذریعے سے بھی مل جانا تحرز کہلائے گا اس لئے اگر فرض اور رد کے ذریعے ماں کو مال ملا تو وہ بھی تحرز ہی ہو گا۔ اس کے لئے اس کو عصبہ حقیقی کیوں تسلیم کیا جائے ہاں عصبہ مجازی بمعنیٰ وارث کے اگر لیا جائے تو اس سے کچھ حرج نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

## ولد الزنا کی میراث

أخبرنا أبو نعيم حدثنا شريك عن محمد بن سالم عن الشعبي عن علي و عبد الله قالا ولد الزنا بمنزلة ابن الملاعنة۔ رواه الدارمي حديث رقم 3103۔

أخبرنا أبو نعيم حدثنا زهير عن الحسن بن الحر حدثني الحكم أن ولد الزنا لا يرثه الذی يدعيه و لا يرثه المولود۔ رواہ الدارمی حدیث رقم 3104۔

حدثنا أبو نعمان حدثنا ابو عوانه عن مغيرة عن ابراهيم قال لا يورث ولد الزنا رواہ الدارمی حدیث رقم 3105۔

پہلی روایت کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے نزدیک ولد الزنا ابن الملاعنہ کی طرح ہے اور اسی پر اہل سنت کا عمل ہے اور باقی دو روایات میں گو کہ ولد الزنا کو میراث دینے کی نفی ہے لیکن اس نفی کو صرف عاہر کے میراث سے نفی پر محمول کیا گیا ہے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ناجائز اولاد کو اس کی ماں اور اس کی ماں کے رشتہ داروں سے تو میراث ملے گی اور وہ اس سے میراث لے سکیں گے لیکن ناجائز اولاد اور ان کے باپ میں آپس میں میراث کا اجراء نہیں ہو گا۔ اسی پر اہل سنت کے تمام مسلکوں کا اجماع ہے۔ اہل تشیع ولد الزنا اور ابن الملاعنہ کے لئے کسی قسم کے توارث کے قائل نہیں جو کہ اصول تمدن کے خلاف نظر آتی ہے۔

## ولد الزنا اور ابن الملاعنہ میں فرق

بظاہر دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا ہے لیکن ان دونوں میں ایک دقیق فرق ہے اور وہ یہ کہ ولد الزنا کا باپ جائز نہیں کیونکہ شریعت نے اس کو اس کا باپ تسلیم نہیں کیا چاہے وہ مدعی ہو جبکہ ابن املاعنہ کا باپ بظاہر موجود ہے لیکن وہ باپ اس بچے کے باپ ہونے سے انکاری ہے پس اگر ابن الملاعنہ کا باپ اس کو اپنا بیٹا تسلیم کرلے تو شریعت اس بچے کو اس کا بیٹا تسلیم کرلے گی اور ان میں باہم توارث قائم ہو جائے گا۔ چونکہ ابن الملاعنہ کا معاملہ لعان پر طے ہوا ہے جس کا انجام آخرت پر چھوڑ دیا گیا ہے اس لئے اگر اولاد زنا توام (جڑواں) پیدا ہو جائیں تو وہ آپس میں اخیافی بھائی ہوں گے اور ابن املاعنہ اگر جڑواں پیدا ہو جائیں تو وہ آپس میں حقیقی بھائی ہوں گے۔(136)

# مجوب اولاد کی میراث

الحمد للہ رب العٰلمین۔ الرحمٰن الرحیم و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خاتم النبیین و المرسلین و علیٰ اصحابہ و آئمۃ الحدیث و الفقہ اجمعین۔

والد کی موجودگی میں اگر کسی بیٹی یا بیٹے کی وفات ہو چکی ہو تو کیا ان کی اولاد اپنے دادا یا نانا کی وفات کے بعد اس کی جائداد میں حصّہ لینے کی اہل ہے یا نہیں؟ رائج الوقت قانون میں ان کو اپنے والد یا والدہ کا حصّہ دیا جاتا ہے جو کہ شریعت کے مدونہ قوانین کے خلاف ہے جس کی وجوہات تفصیل سے ان شاء اللہ بتائی جائیں گی۔

بعض لوگ اس مسئلے کو فقط جذبات کے تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ خود بھی غلطی کر جاتے ہیں اور اپنی اس غلطی میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں حالانکہ میراث ایک شرعی قانون ہے اور قانون میں فیصلہ جذبات پر نہیں بلکہ حقائق پر ہوتا ہے جیسے رأفت (ترس) کی بنیاد پر ہم زانی کو کوڑوں سے نہیں بچا سکتے حالانکہ کس مسلمان کا دل چاہتا ہے کہ کسی مسلمان کو کوڑے لگ جائیں۔ خود حضور ﷺ کو کسی مجرم کو سزا دینے میں تکلیف ہوتی تھی لیکن اس میں سفارش بھی برداشت نہیں فرماتے تھے۔۔ رأفت ہی کے بارے میں سورۃ نور میں ارشاد ہے الزانیۃ والزانی فاجلد و کل واحد مائۃ جلدۃ ولا تاخذ کم بھما رأفۃ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ و الیوم الآخر و لیشھد عذابھما طائفۃ من المؤمنین پس اگر رأفت کوڑے لگانے میں مذموم ہے تو میراث کی قانون میں تصرف میں کیسے جائز ہو سکتا ہے نیز قانون میں ترمیم، اس ترمیم کا مجاز ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ شرعی قوانین کا واضع چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اسلئے اس کی مرضی کے بغیر اس میں تصرف نہیں کیا جاسکتا۔ اب جبکہ ختم نبوت کی وجہ سے قیامت تک وحی کا سلسلہ منقطع ہے اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا کے بعد دین میں کوئی کمی بیشی ممکن نہیں اس لئے اس قانون کی جو تشریح قرآن، سنت اور آثار صحابہ رضی اللہ عنھم سے فقہاء کرام نے لی ہے اسی پر عمل کرنا پڑے گا ورنہ اس کے علاوہ جو بھی قانون ہو گا وہ خدائی قانون نہیں ایک انسانی قانون ہو گا اور یہاں پر خدائی قانون زیر بحث ہے انسانی قانون نہیں۔ اگر اس قانون کو سمجھنا بھی ہو تو اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت سے محروم نہیں رکھا بلکہ اس کے لئے طریقہ کار امت مسلمہ کے پاس موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کیونکہ وہی

یا سنت کے مطابق وضع کردہ طریق کار کے مطابق ہو یعنی اس پر اجماع ہو چکا ہو اور اگر کسی مسئلے میں صحابہؓ میں اختلاف پایا جاتا ہو تو اس کے بارے میں اھل الرائے کے اقوال میں اس کا حل دیکھا جاسکتا ہے اور اگر بالکل جدید مسئلہ ہے تو اس پر مدونہ اصول فقہ کے مطابق غور کیا جاسکتا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں فتویٰ کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ جو دین کو سمجھنے کے لئے صرف قرآن کی بات کرتے ہیں سنت اور اجماع کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ اپنے اوپر بہت ظلم کر رہے ہیں کیونکہ اسی قرآن میں ہے یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ و الرسول ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم اللآخر ذٰلک خیر و احسن تأویلاً۔ اور سورۃ نجم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کے بارے میں ہے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الاّ وحی یوحیٰ اور سورۃ حشر میں ہے وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد ان آیات مبارکہ پر عمل تبھی ہو سکتا ہے جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت مبارکہ کو دین کے سمجھنے میں سامنے رکھیں۔ ان میں جن باتوں پر اجماع واقع ہوا اس میں پھر کلام کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ناسمجھ احادیث شریفہ کے واسطوں پر انگلی اٹھائے گا تو اسے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن اپنی تمام آیات کے ساتھ ہم تک ان ہی واسطوں سے پہنچا ہے جن واسطوں سے سنت ہم تک پہنچی ہے۔ زیر نظر مسئلے کو بھی خالصتاً فقہی بنیادوں پر حل کرنا کوئی مشکل بھی نہیں کیونکہ یہ نہ تو جدید مسئلہ ہے کہ اس پر بہت سارا علمی کام کرنا پڑتا ہو نہ ہی اس کے ساتھ کسی کے ذاتی مفادات وابستہ ہیں کہ اس کے نفاذ میں عملی مشکلات ہوں کیونکہ کس کو پتہ ہے کہ کون پوتا بنے گا اور کون چچا، اس لئے اس مسئلے کو حل کرنے میں گزشتہ چودہ صدیوں میں فقہائے کرام نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسی کو اپنانا چاہیئے بصورت دیگر شریعت کے ہر قانون کے بارے میں شیطان کسی وقتی مصلحت کی آڑ میں وسوسہ ڈال سکتا ہے جو ایمان تک سے فارغ کر سکتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے حق کی اتباع اور باطل سے اجتناب کی دعا کرنی چاہیئے۔

بعض نادان لوگ شاید قرآن کو فقط عربی کی ایک کتاب سمجھتے ہیں حالانکہ قانون کا ادنیٰ طالبعلم بھی یہ سمجھتا ہے کہ اصطلاحات کی پہچان کے بغیر کوئی بھی قانونی دستاویز ناقابل فہم ہوتی ہے اور قانون کی تشریح کا اکثر حصّہ ان اصطلاحات کی تشریح سے وابستہ ہوتا ہے اور ان اصطلاحات کی تشریح یا تو قانون کا واضع خود کرتا ہے یا

پھر اس کی طرف سے کوئی ذمہ دار ادارہ۔پس جن اصطلاحات کا تعین واضع خود کر چکا ہے یا سنت میں اس کے بارے میں وضاحت سے موجود ہے یا اجماع سے ثابت ہے اب اس کو چھیڑنا اس پورے نظام سے بغاوت کے مترادف ہے کیونکہ پھر تو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی اصطلاحات بھی تبدیل ہو سکتی ہیں اور دین کا کوئی بھی حصّہ ان طالع آزماؤں کی دستبرد سے بچ نہیں سکتا۔بلاشبہ ان کا یہ فعل ایک نیا دین بنانے کے مترادف ہو گا ظاہر ہے ان کو ایسا نہیں کرنے دیا جاسکتا اس لئے مقتدر حضرات سے درخواست ہے کہ اس قانون میں جو بے جا تصرف ہوا ہے اس کو سرے سے ختم کیا جائے اور اس کو نئے سرے سے قرآن وحدیث اور اجماع کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے

زیر نظر مسئلہ میں قرآن شریف میں یہ بات صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ میراث میں تقسیم کی بنیاد اقربیت پر ہے احتیاج یا کوئی اور جذباتی سبب پر نہیں ہے کیونکہ یہ فرمایا گیا للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون اور للنساء نصیب مماترک الوالدان والاقربون پس اقرب کی موجودگی میں ابعد محجوب ہوتا ہے اس لئے فقہاء نے میراث میں الاقرب فالاقرب کا قاعدہ بنایا۔پھر جن کے حصّے قرآن وسنت میں متعین ہیں وہ ذوی الفروض کہلائے اور جن کو ذوی الفروض سے بچا کل کا کل مال مل جاتا ہے وہ عصبات کہلائے۔اولاد کے بارے میں یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق اثنتین فلھن ثلثا ماترک وان کانت واحدۃً فلھا النصف میں یہ حکم ارشاد فرمایا کہ اولاد میں صرف عورتیں ہوں تو ان میں کل مال کا دو تہائی تقسیم کیا جائے گا، ایک عورت ہو تو اس کو نصف مال دیا جائے گا اور اگر عورتیں اور مرد دونوں موجود ہوں تو ان میں مردوں کو عورتوں سے دگنا ملے گا۔اسی تشریح پر صحابہؓ کا اجماع ہے۔اس تشریح پر بھی اجماع ہے کہ اولاد میں عورتوں کو ذوی الفروض میں زیادہ سے زیادہ دو تہائی مل سکتا ہے اس لئے اگر بیٹی موجود ہو تو اس کو نصف دینے کے بعد باقی ایک سدس پوتیوں کو دیا جائے گا بشرطیکہ پوتے موجود نہ ہوں اگر پوتے موجود ہوں تو ان میں اور پوتیوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کی قانون کا اجراء ہو گا۔زنانہ اولاد اگر ذوی الفروض میں دو تہائی حصّہ پاچکی ہوں تو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے نزدیک تو باقی زنانہ اولاد عصبات میں بھی حصّہ لینے سے محروم ہوں گی لیکن بعد میں اس پر اجماع ہو گیا کہ زنانہ اولاد کو عصبات میں اس شرط پر حصّہ مل سکتا ہے جب اس کے ساتھ اولاد میں کوئی مرد بھی ہو، چاہے قرب میں اس سے کم ہو، تاہم اس سے زیادہ قرب والا مرد تو عصبات کے قانون کے مطابق سب کچھ ہی لے لے گا۔جیسا کہ متفق علیہ حدیث شریف ہے الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھو لاولی رجل

ذکر یعنی ذوی الفروض سے جب کچھ مال بچ جائے تو وہ سب سے پہلے (مقدم) مرد کو دو اور یہ اجماع سے ثابت ہے کہ پہلے نمبر کا عصبہ بیٹا ہے اور اگر کوئی بیٹا نہ ہو تو پھر پوتا ہے پھر اس کا بیٹا اور پھر اس کا بیٹا وغیرہ۔

بعض لوگوں نے اس میں ولد کی تعریف میں پوتے کو بھی بیٹے کے ساتھ شریک کیا ہے بلاشبہ پوتا بیٹے کے قائمقام ہے اگر بیٹا موجود نہ ہو کیونکہ اس پر ولد کی مجازی معنی کا اطلاق ہوتا ہے لیکن کسی لفظ کا مجازی معنی تب لیا جاتا ہے جب اس کے حقیقی معنی کا محل موجود نہ ہو اگر حاجب محجوب کا تصور سرے سے اڑایا جائے تو پھر تو باپ کی موجودگی میں دادا کو بھی حصّہ دینا پڑے گا کیونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ قول ہے الجد اب نیز ان پوتوں کو بھی حصّہ دینا پڑے گا جن کا باپ موجود ہے اور اگر محجوب پوتے کے والد کو میت کی وفات کے وقت زندہ مان لیتے ہیں تو پھر اس کی اولاد پر ہی کیا موقوف ہے اس محجوب پوتے کی والدہ جو میت کی بہو ہے اپنے میاں کا حصّہ پائے گی اور میت کے بیٹوں کی کیا تخصیص ہے اگر جذباتی بنیاد پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو میت کی نرینہ اولاد اور ماں باپ کی عدم موجودگی میں چونکہ اس کے بہن بھائی بھی وارث ہوسکتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بہن یا بھائی اگر میت کی زندگی میں فوت ہو چکا ہو تو اس کی اولاد کی بالکل وہی حیثیت ہوگی جو محجوب پوتوں پوتیوں وغیرہ کی ہے۔ اس قانون سے بعض دفعہ ایسی صورت حال بھی پیش آسکتی ہے کہ پوتی کو بیٹی سے بھی زیادہ حصّہ ملے مثلاً ایک شخص بوقت وفات دو بیٹے تین بیٹیاں چھوڑتا ہے جبکہ اس کے ایک بیٹے کی وفات اس کی زندگی میں ہوئی ہے جس سے ایک بیٹی موجود ہے۔ اس صورت میں سیکشن نمبر 4 کے تحت کل 9 حصّوں میں 2 حصّے ہر بیٹے کو اور ایک حصّہ ہر بیٹی کو ملے گا جبکہ پوتی کو اپنے والد کے 2 حصّے ملیں گے۔ اس قسم کی صورت حال میں اس قانون کا باطل ہونا اور ناقابل عمل ہونا دوسری طرح بھی اجماع سے ثابت ہو جاتا ہے وہ یوں کہ قرآن شریف میں ماں کے لئے سدس اور ثلث کا ذکر آیا ہے زوجین میں سے کسی ایک کی موجودگی میں اگر ماں باپ بھی موجود ہوں تو حضرت زید بن ثابتؓ کے نزدیک ماں کو ثلث الباقی ملے گا۔ اس پر بعد میں پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا۔ اس کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے جب حضرت زیدؓ سے پوچھا کہ آپ نے ماں کو اس صورت میں ثلث الکل کی بجائے

جو ثلث الباقی دینے کا فیصلہ کیا ہے کیا یہ نص سے ہے یا آپ کی اپنی رائے سے، تو حضرت زیدؓ نے فرمایا اپنی رائے سے کیونکہ اگر میں یہ نہ کروں تو خاوند کی موجودگی میں ماں کا حصّہ باپ سے

بڑھ جائے گا جو کہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ماں کا حصّہ اگر باپ سے زیادہ نہیں تسلیم کیا جاسکتا تو پوتی کا حصّہ بیٹی سے کیسے زیادہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے قال زید ولد الابناء بمنزلة الولد ان لم یکن دونھم ولد ذکر ھم کذکر ھم و اناثھم کاناثھم یرثون کما یرثون و یحجبون کما یحجبون ولا یرث ولد الابن مع الابن پس حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ یہی ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں کنز العمال کی روایت ہے عن جریر، عن مغیرۃ، عن اصحابہ فی قول زید بن ثابت، و علی ابن ابی طالب و عبد اللہ بن مسعود۔ رضی اللہ عنھم۔ اذا ترک المتوفی ابنا فالمال لہ، فان ترک ابنین فالمال بینھما، فان ترک ثلثۃ بنین فالمال بینھم بالسویۃ، فان ترک بنین و بنات فالمال بینھم للذکر مثل حظ الانثیین، فان لم یترک ولد الصلب، و ترک بنی ابن و بنات ابن نسبھم الی المیت واحد، فالمال بینھم للذکر مثل حظ الانثیین، و ھم بمنزلۃ الولد اذا لم یکن ولد، و اذا ترک ابنا و ابنا لابن فلیس للابن الابن شئ، و کذالک اذا ترک ابن ابن و اسفل منہ ابن ابن و بنات ابن اسفل، فلیس للذی اسفل من ابن الابن مع الاعلی شئ، کما انہ لیس لابن الابن مع الابن شئ، و اذا ترک اباہ و لم یترک احداً غیرہ فلہ المال، و ان ترک اباہ و لہ الابنا فللاب السدس و مابقی فللابن، و ان ترک ابن ابن و لم یترک ابنا فابن الابن بمنزلۃ الابن۔ رواہ البیھقی (کنز العمال)

اور اس پر اجماع واقع ھوچکا ہے جیسا کہ مؤطا امام مالك کی عبارت ہے الامر المجتمع علیه عندنا (الی قوله) فان اجتمع الولد الصلب و ولد الابن فکان فی الولد للصلب ذکر فانه لامیراث معه لاحد من ولد الابن فان لم یکن فی الولد

للصلب ذکر و کانتا البنتین فاکثر من ذالك من البنات للصلب فانه لا میراث لبنات الابن معهن الا ان یکون مع بنات الابن ذکر الخ

اس لئے قرآن سے حدیث سے اور اجماع سے ثابت ہوا کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے پوتیاں وارث نہیں ہوسکتے۔ اور جب یہ نہیں ہوسکتے تو نواسے نواسی کا کیا مقام وہ تو ذوی الارحام ہیں۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو مذاہب اربعہ، اہل تشیع، ظاہر یہ سب کے ہاں بیٹے کی موجودگی میں پوتے پوتی نواسا نواسی کا کوئی حصّہ نہیں جس کی پوری تفصیل جسٹس تنزیل الرحمان کی قوانین اسلامی جلد نمبر 5 میں حجب و حرمان کے باب میں دی ہوئی ہے۔

جسٹس صاحب نے ساتھ یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ مجھے کسی بھی مذہب ومسلک کی کتابوں میں بیٹے کی موجودگی میں پوتا پوتی نواسانواسی کا کوئی حصّہ نہیں ملا۔ ساتھ انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ قانون روما اور ہندوؤں کے قانون کا چربہ ہے۔ پشاور ہائی کورٹ کے اپیلیٹ برانچ کے جسٹس عبدالحکیم صاحب اس کے بارے میں تفصیلی رائے دے چکے ہیں۔ ' آپ کے مسائل اور ان کے حل' جلد ششم میں صفحہ 331 سے 339 تک مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ نے اس مسئلے سے متعلق تند وتیز سوالوں کے جوابات دیے ہیں اس کے علاوہ مولانا مجیب اللہ ندوی مدظلہ نے اسلامی فقہ جلد دوم میں صفحہ 699 پر محجوب پوتوں کا مسئلہ چھیڑا ہے اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اب تک بندہ نے میراث کی موضوع پر جس عالم کی بھی کتاب پڑھی ہے اگر اس نے موضوع کو چھیڑا ہے تو اس قانون کی مذمت کی ہے کیونکہ یہ شریعت کے نام پر شریعت کے ساتھ مذاق ہے ۔ جس وقت یہ قانون بنا تھا تو موجودہ وزیر مذہبی امور جناب راجہ ظفرالحق صاحب علماء کرام کی طرف سے اس قانون کی مخالفت میں پیروی کرتے رہے اور ایک موقعہ پر اس وقت کے وزیر قانون کو لاجواب کیا لیکن پھر بھی قانون کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ مقتدر حضرات سے درخواست ہے کہ پاکستان کے پرسنل لاء سے اس تکلیف دہ قانون کو جلد از جلد ہٹایا جائے تاکہ شریعت میں یہ واضح تحریف ختم ہو اور اس سلسلے میں بجائے اس دور انحطاط کے چند اسلامی ممالک کے قوانین کے اسلام کے روشن دنوں کی آزاد خلافتوں اور سلطنتوں کی قوانین سے استفادہ کیا جائے۔ ہندوپاک کے اہل سنت کے لئے تو فتاویٰ عالمگیری اور خلافت عثمانیہ کے دور کے فقہی قوانین سے استفادہ کے لئے رکاوٹ بھی نہیں کیونکہ یہاں اکثریتی مذہب حنفی ہے جو کہ ان مذکورہ سلطنتوں میں بھی رائج تھا۔

بعض حضرات نے پوتے کی اس حالت کو دیکھ کر یہ تجویز کیا ہے کہ دادا کے بارے میں ہم پہلے سے طے کرلیں کہ اس نے پوتے کے بارے وصیت کی ہے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو کہ اس نے وصیت نہیں کی، یہ وصیت واجبہ کہلاتی ہے۔ یہ تجویز چاہے جتنا بھی اخلاص پر مبنی ہو لیکن یہ بھی قرآن کی تعلیمات کے سراسر مخالف ہے کیونکہ میراث کے ضمن میں وصیت کے بارے میں تین جگہ آیا ہے من بعد وصیۃٍ یوصی بھا او دین یا من بعد وصیۃٍ یوصین بھا اوٗ دین اور من بعد توصون بھا اوٗ دین۔ اس میں تینوں جگہ اس وصیت کا ذکر ہے جو کہ کی جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ کہ سب کی طرح وصیت دادا کا اختیار ہے اور کسی کا یہ اختیار نہیں کہ اس سے یہ

اختیار لے لے۔ اس کو ترغیب البتہ دی جاسکتی ہے کہ وہ اس اختیار کو اپنی زندگی میں استعمال کر دے لیکن اگر وہ یہ اختیار استعمال نہیں کر سکا یا نہیں کیا تو اب اپنی طرف سے یہ فرض کرنا کہ اس نے وصیت کی ہے وہ پورے نظام وصیت کو سبوتاژ( Sabotaj ) کرنے کے مترادف ہے۔ فقہ کا عام قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی چیز جو پہلے نہیں تھی اس کا ہونا ثابت نہ ہو جائے تو اس پر نفی کے احکام وارد ہوں گے۔ نکاح طلاق بیع وشراء پاکی ناپاکی میں اس پر عمل ہوتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں کے درمیان نکاح کا نہ ہونا ثابت نہ کیا گیا تو یہ فرض کیا جائے گا کہ ان کا آپس میں نکاح ہوا ہے اس لئے اس فلاں کے ذمے فلاں کے وہ تمام حقوق ثابت ہوگئے جو نکاح سے ثابت ہوتے ہیں ظاہر ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اس لئے وصیت واجبہ کی اصطلاح رأفت ہی کی ایک قسم سمجھی جائے گی کیونکہ میت کے موت کے بعد پوتے پوتی نواسی نواسے کے لئے اگر دادا نے وصیت کی ہے تو اس کو ایسا ہی ثابت کرنا پڑے گا جیسے کسی اور غیر وارث کے لئے۔ سورۃ نساء کی آیت و اذا حضر القسمۃ ۔۔۔ میں یتامیٰ کے ساتھ مساکین کا ذکر بھی آیا ہے کیا ان کے لئے بھی وصیت واجبہ کا قانون بنایا جائے گا اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پوتوں پوتیوں نواسوں نواسیوں کے لئے دادا کو اول تو خود وصیت کرنی چاہیئے یا ان کو اپنی زندگی میں مناسب مال ھبہ کرنا چاہیئے اور اس پر ان کو قبضہ بھی دلانا چاہیئے اور اگر خود اس کو خیال نہ ہو تو ان کے رشتہ داروں کو چاہیئے کہ ان کے دادا کو اس طرف متوجہ کریں۔ حکومت بھی دادا کو ترغیب دینے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈ سکتی ہے جس کے لئے وہ اپنے ذرائع ابلاغ کے وسائل سے استفادہ کر سکتی ہے۔

اگرچہ یہاں پر میراث سے متعلق قوانین زیر بحث ہیں اس لئے اخلاقی تقاضوں پر بحث مناسب نہیں تھی لیکن اس مسئلے میں چونکہ بعض حضرات اس مسئلے کا جذباتی رخ زیادہ سامنے لانا چاہتے ہیں اور بعض ملحد تو اس کو بنیاد بنا کر اسلام سے بعض لوگوں کو متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ یتیموں سے متعلق اسلام نے جن اخلاقی تقاضوں کی طرف متوجہ کیا جائے ان کا تھوڑا ساذکر کیا جائے۔

سورۃ قیامۃ میں یہ ارشاد فرمایا گیا: فلا اقتحم العقبۃ و ما ادراک ماالعقبۃ فک رقبۃ اوٗ اطعام فی یوم ذی مسغبۃٍ یتیماً ذا مقربۃٍ اوٗ مسکیناً ذا متربۃ۔

جس کا مقصد یہ ہے کہ خاندان اور معاشرے کے ان بے سہارہ لوگوں یعنی یتیموں اور مسکینوں کی امداد واعانت کی گھاٹی پار نہ کر سکا وہ خلق خدا اور دین کے اور کیا کام آئیں گے۔ سورۃ والضحیٰ میں ہے فاما الیتیم فلا تقھر و

اما السائل فلا تنھر۔ اس طرح سورۃ فجر میں ارشاد ہے کلا بل لا تکرمون الیتیم و لا تحاضون علیٰ طعام المسکین و تأکلون التراث اکلالما و تحبون المال حباً جماً۔ پس اسلام نے تو ہمیں یتیم کی قدر کی اعانت اور پرورش کی تعلیم دی ہے اور یہ اخلاقیات کا ایک اہم شعبہ ہے اور اصل منزل مقصود یعنی خدا تک پہنچنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے جیسا کہ بخاری شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح قریب ہوں گے جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں ایک دوسرے کی قریب ہوتی ہیں، لیکن یہ سب کچھ بطور امتحان ہمارے اختیار پر چھوڑا ہے کہ کون اللہ تعالیٰ کو اس سے راضی کرتا ہے اور کون اس زرین موقعہ کو گنواتا ہے اگر قانون میں اس کو شامل کرنا منظور ہوتا تو اس کے لئے بھی میراث کے قوانین میں حکم آجاتا۔ میراث کے قوانین تو اتنے اٹل ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی اس میں اس وقت تک کچھ فیصلہ نہ فرماتے جب اس کے لئے واضح حکم نہ آتا اور حضرت جابرؓ کی حدیث شریف اس پر گواہ ہے یتیم کے معاملے میں غفلت بلاشبہ ایک بہت بڑی غلطی ہے لیکن ان سے زیادہ غلطی وہ لوگ کریں گے جو رأفت سے مجبور ہو کر شریعت میں انگلی ڈالیں گے اور اس استحبابی امر کو واجب قرار دیں گے۔

جو لوگ بھی اس قانون کی مخالفت کر رہے ہیں ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یتیم کے سر پر ہاتھ نہ پھیرا جائے یا نواسے، نواسی پر رحم نہیں کرنا چاہیئے۔ اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تو نواسوں پر شفقت کا ایک عظیم مظاہرہ ہے صرف اتنی بات ہے کہ جیسے یہاں محاورہ ہے کہ کسی کو قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیئے معاملہ قانون کے سپرد کرنا چاہیئے چاہے کتنی ہی قابل رحم حالت ہے، تو یہاں بھی یہی دہائی دی جارہی ہے کہ جو کچھ بھی کرو کرو لیکن خدا کا قانون ہاتھ میں نہ لو۔ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء کی آیت نمبر 11 میں یہی تو ارشاد فرمایا ہے آباء کم و ابناء کم لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعاً فریضۃً من اللہ ان اللہ کان علیماً حکیماً۔ پس جب ہم نہیں جانتے کہ انصاف کیا ہے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے تو عقلمند وہ لوگ ہیں جنہوں نے علیم و حکیم کی بات پر لبیک کہا اور سر تسلیم خم کیا۔ اسی کو اسلام کہتے ہیں اور اسی کو دین حنیف کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح مسلمان اور حنیف بنا دیں۔ آمین ثم آمین۔

اللّٰھمَّ ارِنا الحق الحق و ارزقنا اِتّباعه و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# قرآن و حدیث میں محجوب اولاد کے بارے میں وصیت کا حکم

اگر کسی کی زندگی میں اسکی صلبی اولاد میں سے کوئی فوت ہو جائے اور اس کے بیٹوں میں کوئی موجود ہو تو اس میت کے پوتوں نواسوں کو الاقرب فالاقرب قانون کے مطابق ازروئے شریعت میراث میں کچھ نہیں ملے گا جس کو بندہ نے اس مقالے کی پہلے حصّے میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے دوبارہ اس کا یہاں ذکر مناسب نہیں ہو گا بوقت ضرورت اس حصّے کو اس کے پہلے حصّے کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔

اگر محجوب اولاد کو شریعت کے مطابق میراث میں کچھ نہیں ملتا تو پھر زیر بحث صرف یہ رہ جاتا ہے کہ شریعت کے مطابق محجوب اولاد کو کیا مل سکتا ہے تاکہ اس کے لئے مناسب قانون سازی کی جا سکے۔

شیخ محمد ابوزھرہ نے احکام الترکات والمواریث میں اس کا یہ حل تجویز کیا ہے کہ دادا پر یہ واجب ہے کہ وہ محروم اولاد کے بارے میں ایک ثلث کے اندر ایسی وصیت کرے کہ جتنا حصّہ ان کو ان کے باپ کے زندہ ہونے کی صورت میں ملتا وہ ان کو ملے اگر ان کا حصّہ ایک ثلث سے بڑھ جائے تو اس پر صرف ثلث کے اندر وصیت واجب ہے اور اگر دادا وصیت نہ کرے تو قانون سے ان کو اس اصول کے مطابق حصّہ دلوایا جائے اور اگر وہ ان کے لئے ان کے ممکنہ حصّے سے کم کی وصیت کرے تو اس کو ایک ثلث کے اندر اندر پورا کیا جائے اور اگر اس نے اولاد کے لئے ان کے حصّے سے زیادہ کی وصیت کی تو اس زائد حصّے کا حکم دیگر اختیاری وصیتوں کی طرح ہو گا اور وصیت واجبہ دیگر تمام وصایا پر مقدم ہو گی۔

یہ وصیت واجبہ کہلاتی ہے اور اسکی بنیاد پر مصر شام وغیرہ میں قانون سازی بھی کی گئی ہے اس لئے بعض حضرات اس کو یہاں بھی قانون سازی کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔

یہ تجویز چاہے جتنی بھی اخلاص پر مبنی ہو لیکن یہ قرآن کی تعلیمات کے سراسر مخالف ہے۔ اس کے کئی شقیں ہیں جن پر علیحدہ علیحدہ بحث کی ضرورت ہے۔

ان مباحث میں کئی سوالات اٹھ سکتے ہیں جن کا جواب دینا اس بحث کے لئے لازمی ہو گا۔

سوال نمبر 1۔ کیا دادا پر یا کسی اور مورث پر محروم اقربا کے لئے وصیت کرنا واجب ہے؟

سوال نمبر 2۔ اگر وصیت واجب نہ ہو تو کیا انتظامی امور کے لئے اس کو بذریعہ قانون واجب کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر 3۔ اگر اس پر وصیت کرنا واجب ہے لیکن وہ اس وصیت کو کر نہیں پاتا قصداً یا سہواً تو کیا سٹیٹ وہ وصیت جو اس پر واجب تھی اس کو خود بغیر اس کے عندیہ کے نافذ کر سکتی ہے؟

سوال نمبر 4۔ کیا میراث سے محروم صرف اولاد ہوتی ہے یا کوئی اور بھی الاقرب فالاقرب کی قانون کی زد میں آکر میراث سے محروم ہو سکتا ہے؟

سوال نمبر 5۔ اگر محروم اولاد کو اس محرومی سے بچانے کے لئے وصیت واجبہ کا قانون بنایا جاتا ہے تو دوسرے محروم رشتہ داروں کے لئے کیوں نہیں؟

اب ان سوالوں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جارہا ہے۔

پہلے سوال کا جواب ہمیں جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے سب پہلے قرآن میں تلاش کرنا پڑے گا۔ مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو احادیث شریفہ سے مدد لی جائے گی۔ پھر جس تحقیق پر اجماع ہو گا اس کو لیں گے ورنہ فقہاء کرام کی آراء میں مسئلے کا حل تلاش کیا جائے گا۔ تو سب سے پہلے قرآن پاک میں اس کا جواب تلاش کرتے ہیں ۔ سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر 180 کتب علیکم اذا حضر الخ میں وصیت کے بارے میں صریح حکم ہے لیکن یہ حکم باقی ہے؟ یا منسوخ ہو چکا ہے؟ ان سوالوں کا جواب مفسرین دے سکتے ہیں۔

عہد صحابہؓ کے مفسر سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ سے اپنی تفسیر میں منقول ہے کہ یہ آیت آیات میراث سے منسوخ ہو گئی۔

علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت حدیث لا وصیۃ لوارث سے منسوخ ہو گئی۔ مزید لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ حدیث اخبار آحاد میں ہے لیکن تمام فقہاء نے اس کو قبول کیا ہے جس کی بنا پر یہ حدیث متواتر کا درجہ پا گئی، کیونکہ فقہاء صحابہؓ و تابعینؒ کسی حدیث کو اسی صورت میں قبول کریں گے جب کہ وہ ان کے نزدیک انتہائی درجہ صحت کو پہنچ چکی ہو اس لئے یہ آیت لا وصیۃ لوارث سے منسوخ ہو سکتی ہے۔

قاضی بیضاویؒ علامہ زمخشری سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خبر واحد سے قرآن کی آیت منسوخ نہیں ہوسکتی اور ان کے اس نظریئے کو قبول کرنے سے انکار فرماتے ہیں کہ خبر واحد امت میں قبولیت پانے سے متواتر کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ ان کی رائے میں وہ زیادہ سے زیادہ خبر مشہور ہوسکتی ہے جس سے آیت قرآنی منسوخ نہیں ہوسکتی اس لئے قاضی بیضاویؒ اس کے نسخ سے تو انکار کرتے ہیں لیکن یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر الخ سے وہ وصیت مراد لیتے ہیں جس کا ذکر مذکورہ آیت میں ہے۔

ام التفاسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ یہ حکم اسلام کی ابتدا میں تھا لیکن بعد میں آیات میراث کے ذریعے منسوخ ہوا جیسا کہ ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، قتادہ، شریح و مجاہد وغیر ھم رحمھم اللہ کی تحقیق ہے اور احمد، عبد بن حمید اور ترمذی نے تخریج کی اور اس کو صحیح بتایا اور نسائی و ابن ماجہ نے عمروؓ بن خارجہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سواری پر یہ خطبہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کا حصّہ میراث سے متعین کیا ہے پس وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ آگے بیان فرماتے ہیں کہ ان احادیث مبارکہ کو امت میں تلقی بالقبول حاصل ہے بلکہ بعض نے ان کو متواتر کے زمرے میں شامل کیا ہے کیونکہ متواتر اس کو کہتے ہیں کہ اس کو اتنے لوگ روایت کریں کہ انکے کذب پر اجتماع کا گمان نہ ہو اور یہ کہ اس پر بغیر نکیر کے عمل ہے کہ نسخ اصل میں آیات میراث سے واقع ہے اور احادیث شریفہ نسخ کی جہت کو بیان کررہی ہیں اور فخر الاسلامؒ نے اس کو دو طرح سے بیان فرمایا ہے:

1۔ کیونکہ آیات میراث بالاتفاق آیت وصیت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ( من بعد وصیۃ یوصی بھا اَوْدین ) پس میراث کو وصیت (نکرہ) پر مرتب فرمایا اور پہلی وصیت معہودہ (معرفہ) تھی اب اگر وہ وصیت معہودہ باقی ہوتی تو یہاں پر بھی میراث کی ترتیب وصیت معہودہ پر ہوتی سو جب یوں ترتب نہیں ہوا اور ترتب وصیت نکرہ پر ہوا تو اس نے وصیت مقیدہ کے منسوخ ہونے پر دلالت کی کیونکہ تقیید کے بعد اطلاق نسخ ہوتا ہے جیسا کہ اطلاق کے بعد تقیید نسخ ہوتا ہے دونوں کے معنیٰ مختلف ہونے کے سبب سے۔

2۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک انتہائے محض کے بعد ابتدا اور دوم ایک محل سے دوسرے محل کو کسی حکم کا منتقل کرنا جیسا کہ نسخ قبلہ۔ زیر بحث مسئلہ اسی دوسری قسم سے ہے کہ پہلے انصاف کے ساتھ وصیت کرنے کا حکم ہوا کہ والدین اور اقربین کے لئے مناسب حصص کا تعین موصی پر چھوڑ دیا گیا لیکن جب انسان اس حسن

تدبیر سے جو اس میں مطلوب تھی عاجز آیا تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا بھی طریقہ بتایا اور سب کے حصّے مقرر فرمائے۔

حافظ ابن کثیرؒ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کے مطابق امت پر پہلے والدین اور اقربین کے لئے وصیت واجب تھی لیکن میراث کے احکام نے اس وصیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔

ابن کثیرؒ اس پر قدرے تفصیل سے لکھنے کے بعد تفصیلاً اپنی رائے بیان کرتے ہیں کہ آیت میراث نے تو ورثاء والدین اور اقربین کے بارے میں وصیت کا حکم ختم کر دیا کیونکہ ان کے بارے میں جدید حکم نے قدیم کی جگہ لے لی اور وہ قرابت دار جن کا حصّہ وراثت میں مقرر نہیں ان کے حق میں تہائی کے حد تک وصیت کرنا بطور استحباب باقی رہ گیا۔ اس کی استحباب کی دلیل حضرتؒ نے یہ دی ہے کہ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کسی مسلمان کو لائق نہیں کہ اس کے پاس کوئی چیز ہو اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو کہ وہ دو راتیں بغیر وصیت کئے گزارے۔

تفسیر خازن میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ فخر مباہات کے لئے بعید رشتہ داروں کے حق میں وصیت کیا کرتے تھے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو تنگدست چھوڑ جایا کرتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں کے حق میں وصیت کو واجب کر دیا۔ پھر یہ آیت، میراث والی آیت سے منسوخ ہوئی۔

امام رازیؒ نے اس پر تفصیل سے بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ اس میں اگرچہ امام رازی نے اس آیت کے نسخ کے اقوال پر اعتراضات کئے ہیں لیکن ساتھ ہی جمہور کا استدلال بھی بہت مناسب انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت امامؒ اس کے نسخ کے تو قائل نظر نہیں آتے کیونکہ انہوں نے وجوہات نسخ کا فلسفیانہ انداز میں علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا ہے اور اپنے نظریئے کے مطابق ثابت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی لیکن اس کی تخصیص کے امکان کو رد نہیں کر رہے ہیں۔ پھر آگے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اکثر مفسرین نے اس کو لیا ہے کہ یہ آیت ہر قریبی وارث اور غیر وارث کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے۔ جن چند مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ان قرابت داروں کے حق میں جو وارث ہیں منسوخ ہو چکی ہے لیکن جو قرابت دار وارث نہیں ہیں ان کے حق میں اب بھی قائم ہے، انکی طرف سے دو دلائل بیان فرماتے ہیں۔ ان کی طرف سے پہلی دلیل یہ بیان کی ہے کہ چونکہ اس آیت کے نسخ پر اجماع نہیں اس لئے

جن کے بارے میں نیا حکم ثابت نہیں( غیر وارث اقربین ) ان کے بارے میں اس کو محکم مانا جائے۔

دوسری دلیل یہ بیان فرمائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ اس کے پاس کچھ مال ہو اور وہ اس کے بارے میں وصیت کرنا چاہے تو بغیر وصیت کے دوراتیں بھی گزارے اور ہم سب کا اجماع ہے کہ غیر قرابت دار کے لئے وصیت واجب نہیں اس لئے ضروری ہوا کہ غیر وارث قرابت دار کے لئے وصیت کرنا واجب قرار دیا جائے اور اس وجوب کے لئے سنت کو قرآن کا مؤکد کیا جائے۔

ان دلائل کے بعد ان کے مقابلے میں جمہور کی اس دلیل کو بھی بیان فرماتے ہیں یعنی من بعد وصیة یوصی بھا اوْ دین سے وصیت کے عدم وجوب پر استدلال۔

علامہ قرطبیؒ نے اس مسئلے پر یوں اظہار فرمایا ہے کہ بلا شبہ یہ امر ظاہر ہو گیا کہ وارث اقربا کے حق میں وصیت کا وجوب سنت کے ذریعے منسوخ ہو چکا ہے اور تمام اجماع کرنے والے علماء اور فقہاء نے اسی سنت سے استدلال کیا ہے۔

حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ کے استاد حضرت ملا جیونؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "یہ آیت آیات میراث اور حدیث ذیل سے منسوخ ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مجمل ہے اور آیت میراث اس کا بیان ہے رہا یہ قول کہ وصیت کا حکم اس صورت میں ہے جب والدین غیر مسلم ہوں یا غلام ہوں یا کوئی اقرب جو کسی اور قریبی کی وجہ سے محروم ہو جیسا کہ امام زاھدؒ نے کہا ہے تو یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس صورت میں وصیت زیادہ سے زیادہ جائز ہو گی فرض نہیں ہو گی ہاں اگر صاحب ھدایہ اور صاحب مدارک کے موافق یہ معنی لئے جائیں کہ کتب علیٰ سبیل الاستحباب تو بات کچھ بن جاتی ہے"۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس آیت کی تفسیر میں بغیر ورثا کی رضا کے وارث کے لئے وصیت کے ناجائز ہونے پر اجماع نقل کیا ہے اور اس کے لئے کئی احادیث شریفہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ " یہ آیت حق ورثاء میں منسوخ ہے۔ اور سوائے وارثوں کے اور اقارب کے بارے میں ساکت ہے اس سے نہ اثبات نکلتا ہے نہ نفی۔ لیکن وصیت کے واجب نہ ہونے پر ابن جوزیؒ ایک حدیث لائے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص پر دو یا تین راتیں گزریں اور اس کے

پاس کچھ مال ہو اور وہ وصیت کرنے کا ارادہ کرتا ہو تو اس کی وصیت لکھی گئی ہے (یعنی وصیت کا اس کو ثواب ملے گا) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ وصیت واجب نہ ہونا اس حدیث سے اس طرح نکلتا ہے کہ حضور ﷺ نے وصیت کو اس کے ارادے پر رکھا ہے اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ وصیت واجب نہیں۔ اپنے اقارب میں سے غیر وارث کے لئے وصیت کے جائز

ہونے پر سب علماء کا اتفاق ہے بلکہ اپنے رشتہ دار کے حق میں وصیت کرنا اور بھی زیادہ اولیٰ اور

137

باعث ثواب ہے۔ کیونکہ یہ وصیت صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔

احادیث نبوی۔ وارث کے لئے کوئی وصیت کرنا جائز نہیں کے مسئلے پر کتب احادیث میں متعدد روایات موجود ہیں مفسرین کرام نے بھی کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت الخ کے نسخ کے بارے میں ان احادیث شریفہ کے بارے میں کلام کیا ہے جس سے ان کی رائے میں یا تو مذکورہ آیت منسوخ ہے یا اس کی تخصیص ہوئی ہے۔

محدثین میں امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں باب کا عنوان 'لاوصیۃ لوارث' کے الفاظ سے قائم کیا ہے۔ یہ جملہ محدثین کی روایت کا ہی ایک حصہ ہے۔ امام بخاریؒ اس عنوان کے تحت بذات خود ایسی روایت نہیں لائے ہیں جس کا بعینہ متن 'لاوصیۃ لوارث' ہو بلکہ حضرت عطاءؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ اثر روایت کیا ہے کہ 'عطاءؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اولاً مال اولاد کے لئے تھا اور والدین کے حق میں وصیت تھی پس اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جس کو جس طرح پسند فرمایا منسوخ کر دیا۔ لہٰذا لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے برابر اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے 1/6 اور زوجہ کے لئے 1/8 یا 1/4 اور شوہر کے لئے 1/2 یا 1/4 حصہ مقرر کر دیا۔ صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ 'بخاری کا ترجمۃ الباب' لاوصیۃ لوارث' ایک مرفوع حدیث کا فقرہ ہے۔ چونکہ اس حدیث کے روایت کنندگان امام بخاریؒ کی شرط کے مطابق پورے نہ اترے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے طریقہ کے مطابق متن حدیث کے الفاظ کو اپنے باب کا عنوان مقرر فرما دیا اور ترمذی و ابوداؤد وغیرھما نے اس حدیث کا متن اپنی سندوں سے روایت کیا ہے۔ جو کہ حضرت ابو امامہؓ سے بایں عبارت ہے۔ 'سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فی خطبۃ فی حجۃ الوداع' ان اللہ قد

اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث ' اس حدیث کی سند کے ایک راوی اسمٰعیل بن عیاش ہیں جن کی روایت کو شامی مشائخ سے ائمہ کی ایک جماعت نے مکمل قوی بتایا ہے۔ ان ائمہ کے منجملہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ بھی ہیں

138

اور اس حدیث کو اسمٰعیلؒ بن عیاش نے شرحبیل بن مسلم سے روایت کیا ہے جو کہ شامی مشائخ میں محدثین کے نزدیک ثقہ شیخ ہیں اور ترمذی کے استخراج میں ان کا بصراحت ذکر موجود ہے۔ خود ترمذیؒ نے اس حدیث کے متعلق 'حدیث حسن' کے الفاظ استعمال کیے ہیں نیز ترمذی اور نسائی نے اسی متن حدیث کو عمروؓ بن خارجۃ سے روایت کیا ہے، ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے اور دار قطنیؒ نے عمرو بن شعیب بن عبد اللہؒ اور حضرت جابرؓ سے بھی روایت کیا ہے اور حضرت جابرؓ کی روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے۔ ان احادیث کی اسناد کے بارے میں اگرچہ محدثین نے گفتگو کی ہے لیکن مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی اصل ثابت ہے البتہ نسائی کی ایک روایت ہے جس کے تمام راوی انتہائی مستند ہیں۔ کے بارے میں نسائی ثقہ لا بأس بہ کے الفاظ ہین، ابن حبان اور مسلمۃ بن قاسم اسکو ثقہ کہتے ہیں۔ دوسرے راوی کے بارے میں ابن مھدی الائمۃ اربعہ فذکرہ فھم لکھتے ہیں امام احمد بن حنبل ان کو حافظ اور علی بن المدینی ان کو ثقہ بتاتے ہیں۔ یحیٰ بن معین ان کے بارے میں ثبت ثقہ صحیح الحدیث کا تبصرہ لکھتے ہیں تو ابو حاتم الرازی ان کو ثقہ امام اور محمد بن سعد ثقہ مامون اور حجۃ بتاتے ہیں۔ اسمٰعیل بن خالد ابن مھدی، یحیٰ بن معین نسائی، العجلی اور ابو خاتم الرازی کے نزدیک ثقہ ہیں جبکہ یعقوب بن قتیبہ انکو ثقہ ثبت بتاتے ہیں۔ اس حدیث شریف کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام حقداروں کو ان کا حق دے دیا اور وارث کے لئے وصیت نہیں۔ اس حدیث شریف کے متن سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمام حقداروں کو ان کا حق دے دیا تو وہ کونسے اقرباء ہیں جن کا حق وارثوں کو ان کا حصّہ دینے کے بعد بھی باقی رہا۔ ظاہر ہے لفظ قد اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جن کا حق تھا وہ ادا ہو چکا۔ سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق کن کا تھا تو نصیباً مفروضاً سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ورثاء ہی تھے اس لئے یہ پتہ چلا کہ ورثاء کا حق ان کو مل چکا ہے اس لئے لازمی بات ہے کہ اب ان کو کسی اور ذریعہ سے نہیں ملنا چاہیئے اس لئے فرمایا کہ وارث

کے لئے وصیت نہیں۔ امام شافعیؒ نے 'کتاب الام' میں کہاہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت تواتر کو پہنچ چکی ہے چنانچہ فرمایاہے' ہم نے اھل فتویٰ اور ان تمام اھل علم بالمغازی قرشین کو جن سے ہم سنتے رہے ہیں اس روایت کو نقل کرتے پایا، نیز ان کے ماسوادوسرے حضرات کو بھی ان میں سے کسی کا آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کو سال فتح مکہ میں ارشاد فرمانے سے اختلاف نہیں ہے اور جن اھل علم نے ان حضرات سے ملاقات کی وہ سب اس کو مسلسل روایت کرتے چلے آئے ہیں اس لئے یہ روایت 'نقل کافۃ عن کافۃ' قرار پائی جو کہ خبر واحد سے قوی تر ہوا کرتی ہے۔ وارث کے حق میں وصیت نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کے لئے اب وصیت کرناواجب نہیں رہا، البتہ اگر ورثاء اجازت دے دیں تو وصیت نافذ ہوگی۔

دار قطنی نے بذریعہ ابن جریج بواسطہ عطاء ابن عباس سے اس حدیث کو مرفوع روایت کیاہے جس کا متن یہ ہے' لا تجوز وصیۃ لوارث الا ان یشاء الورثۃ ' اس روایت کے تمام راوی ثقۃ ہیں البتہ یہ حدیث باین معنی معلول کہی جاسکتی ہے، جس کی بناء پر یہ کہا جاسکتاہے کہ یہ عطاء خراسانی ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتاہے کہ عطاء بن ابی رباح ہیں. واللہ اعلم۔ امام بخاری نے بھی اس علت کے پیش نظر اس متن حدیث کو سنداً روایت نہیں کیا بلکہ حدیث کے متن کو اپنے باب کا عنوان کر دیا،( اور یہ عنوان مقرر کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ اصل متن امام بخاریؒ نزدیک بھی ثابت الاصل ہے ) اور عطاء بن ابی رباح کی موقوف روایت حضرت ابن عباسؓ سے بیان کر دی۔ چناچہ یہ روایت اگرچہ موقوف ہے، لیکن دوسری روایات کے سبب جو اسی مضمون کو ادا کرتی ہیں حکماً مرفوع قرار پاگئی۔

140

اس عنوان کے ذیل میں جسٹس تنزیل الرحمٰن نے بہت عمدہ بحث کی ہے جو کہ مجموعہ قوانین اسلامی کے پانچوں جلد میں صفحہ نمبر 1659 سے 1663 تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کو من و عن نقل کرنے کی بجائے عدالت کی توجہ اس کے آخر میں جسٹس صاحب کے آخری نچوڑ کی طرف مبذول کرتا ہوں کیونکہ مذکورہ صفحات کے اگر پڑھنے کی ضرورت ہو تو وہیں سے پڑھے جاسکتے ہیں۔

"بیان کردہ کل روایات کا جائزہ لینے کے بعد بآسانی اس نتیجہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ 'لاوصیۃ لوارث' میں کل نو روایات متفق ہیں اور ' لایجوز لوارث ' میں کل چار روایتیں متفق ہیں۔ اور دو روایتیں ' لایجوز الوصیۃ لوارث ' کی عبارت میں متفق ہیں۔ لیکن ان عبارتوں کا اختلاف حدیث کے منشاء اور مقصد میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا۔ تمام عبارتوں کا منشاء یہی ہے کہ وارث کے حق میں وصیت ناجائز اور نادرست ہے۔ احادیث کے نو متن ایسے ہیں جن میں لا نفی جنس استعمال کیا گیا ہے جو اس امر کا مقتضی ہے کہ وارث سے وصیت کی ماہیت اور اس کی جنس کی نفی کر دی گئی ہے۔ یعنی وصیت کا چھوٹا، بڑا یا اوسط کوئی فرد وارث کے حق میں جائز نہ ہو گا۔ چار متون میں ' لایجوز لوارث ' کی عبارت ہے جس میں 'وصیۃ' کا لفظ نکرہ سیاق نفی میں آیا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب نکرہ سیاق نفی میں واقع ہوتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ چناچہ حدیث ' لایجوز لوارث وصیۃ' کے معنی یہ ہوئے کہ وارث کے حق میں وصیت کا کوئی فرد جائز نہیں۔ یعنی خواہ وصیت کثیر مال کی ہو یا قلیل مال کی۔ اور یہ معنی ' لا وصیۃ لوارث ' سے متفق ہیں۔ البتہ دو روایتوں میں وصیت کے لفظ کو معرفہ باللام ' الوصیت ' ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے معرفہ لانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سابقہ احادیث سے بلحاظ معنی کچھ اختلاف ہو۔ کیونکہ یہ الف لام الوصیت میں جنسی بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہوں گے، وارث کے حق میں جنس وصیت جائز نہیں۔ اور الف لام استغراقی بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس عبارت کے وہی معنی ہوں گے جو نکرہ کے سیاق نفی میں آنے سے ہوا کرتے ہیں۔ یعنی وارث کے لئے وصیت کا کوئی فرد جائز نہیں۔ چنانچہ اس توضیحی بیان سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ احادیث کی تمام عبارتیں معنوی حیثیت میں متحد ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ الوصیۃ میں جس طرح الف لام جنسی یا استغراقی ہو سکتا ہے اسی طرح یہ احتمال بھی ہے کہ یہ الف لام عہد خارجی ہو اور اس سے وصیت کی ایک مخصوص قسم و فرد مراد ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر الف لام تعریفی کو عہدی تصور کیا جائے تب بھی اس سے اس وصیت کی طرف اشارہ ہو گا جس کو کتاب اللہ میں وراثت کی آیت کے نزول سے قبل لازم کیا گیا تھا۔ یعنی ' اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر ان الوصیۃ للوالدین والاقربین ' کی جانب۔ چنانچہ حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ وصیت جو کتاب اللہ میں ' اذا حضر احدکم الموت ' سے واجب کی گئی تھی اب لازم نہیں۔ چنانچہ اس صورت میں بھی وارث کے حق میں وصیت کا ناجائز ہونا ثابت ہو گا۔

## وارث اقرباء کے حق میں وصیت کے متعلق فقہا کرام کی آراء

علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ فقہاء امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ میت کے اقرباء کے موجود ہوتے ہوئے غیر شخص کو وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ حسن و طاوس رحمھم اللہ فرماتے ہیں کہ غیر وارث اقرباء کے ہوتے ہوئے اجنبی کے حق میں وصیت ان اقرباء کی طرف پھیر دی جائے گی۔ اسحاقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ وارث اقرباء کے حق میں وصیت کے باطل ہونے پر اجماع کے ساتھ اس پر بھی اتفاق ہے کہ وارث کے حق میں میت کے ورثاء وصیت کی اجازت دے دیں تو وصیت نافذ کر دی جائے گی البتہ اہل ظاہر اور امام مزنیؒ ورثاء کی اجازت کے بعد بھی وصیت کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام شعرانیؒ نے میزان الکبری میں امام زھریؒ کو بھی اس قول میں اہل ظاہر کے ساتھ شامل کیا ہے۔ لیکن اصح اور مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ وارث کے حق میں وصیت موصی (وصیت کرنے والے) کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کی رضامندی سے قابل نفاذ ہوگی۔ البتہ موصی کی زندگی میں دیگر ورثاء کی رضامندی کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

## حنفیہ

المبسوط میں امام سرخسی نے لکھا ہے کہ آیت 'کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الخ' کے متعلق اکثر مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں اس وقت تک تھا جب تک مواریث کی آیت نازل نہ ہوئی تھی جو آیت موارث کے نزول کے بعد منسوخ ہو گیا۔ البتہ اس کے ناسخ ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔ ابو بکر رازیؒ کا خیال ہے کہ آیت وصیت کا حکم ' من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین ' کے ذریعہ منسوخ ہوا، کیونکہ اس آیت میں اس امر پر نص موجود ہے کہ میراث وصیت کے بعد تقسیم کی جائے، نیز وصیت کا لفظ نکرہ وارد ہوا ہے۔ لہٰذا والدین اور اقربین کے لئے وصیت ثابت تھی تو ایسی صورت میں وصیت کو " معرفہ باللام " لا کر میراث کا ذکر اس کے بعد کرنا چاہیئے تھا، کیونکہ وصیت ایک معین امر تھا۔ یہی قول امام شافعیؒ کا ہے، اگرچہ ان کے مذھب میں سنت کے ذریعے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں۔ امام رازیؒ کتاب اللہ کا نسخ سنت متواترہ کے ماسوا دیگر اقسام سنت سے جائز نہیں سمجھتے، لیکن اکثر حنفی علماء فرماتے ہیں کہ وصیت کا مذکورہ بالا قرآنی حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد " ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث " سے منسوخ ہو گیا۔ یہ مشہور

حدیث سے نسخ جائز ہوتا ہے کیونکہ جس حدیث کو علمائے امت قبول و عمل میں تسلسل بخشیں وہ حدیث ایسی سمجھی جاتی ہے گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس کو (خود) سن لیا گیا ہو چنانچہ اگر ہم خود حضور صلی اللہ اعلیہ و آلہ وسلم کو اس طرح فرماتے سن لیتے کہ " یہ آیت باعتبار حکم منسوخ ہوگئی، اس پر عمل نہ کرنا" تو ہمارے لئے اس آیت پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا۔ حضرت ابو قلابہ نے اس حدیث کو مذکورہ الفاظ سے روایت کیا ہے اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ زائد ہیں " الا ان یجیز الورثہ " ان الفاظ کی زیادتی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی وصیت کی جواز میں نفی ہے وصیت کے ثبوت کی نفی نہیں۔ جواز کی نفی کے ساتھ یہ لازمی ہے کہ فرضیت اور وجوب کی بھی نفی ہو جائے۔ مذکورہ حدیث جس سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے اگرچہ اس سند سے وہ مرسل ہے لیکن ہمارے نزدیک مرسل حدیث حجت ہوتی ہے جس طرح کہ مسند حدیث لائق حجت ہوا کرتی ہے بلکہ استدلالی حیثیت میں حدیث مرسل حدیث مسند حدیث سے بھی زیادہ قوی ہوا کرتی ہے کیونکہ جب راوی کسی حدیث کے متن کو محض ایک شخص سے سنتا ہے تو اس شخص کا نام محفوظ کرلینا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا لیکن اگر کثیر تعداد میں اشخاص سے سنتا ہے تو ان سب کا محفوظ کرلینا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے اس لئے وہ ارسال اختیار کرلیتا ہے گویا کہ کسی مشہور راوی کا ارسال اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ حدیث انتہائی درجے میں مشہور ہوچکی تھی۔

مندرجہ بالا اقتباس سے سے جو حنفی نقطہ نظر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وصیت کی آیت قرآن کی آیت میراث سے منسوخ ہوگئی نیز سنت سے بھی، کیونکہ احناف کے نزدیک سنت مشہورہ بلکہ مرسل احادیث سے بھی کتاب اللہ کی نسخ ہوسکتی ہے نیز اس حدیث پر چونکہ جمہور کا اجماع ہوچکا ہے اس لئے وہ قابل عمل ہوگئی اور آیت کا نسخ صحیح متصور ہوگا۔

## م الکیہ

شرح مؤطا امام مالک الزرقانی، محمد بن عبد الباقی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مطابق امام مالک کے نزدیک بھی وصیت کی آیت میراث کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے اور سنت قائمہ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں الا یہ کہ دیگر ورثاء اجازت دے دیں۔

## شافعیہ

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الام میں اس پر واضح کلام فرمایا ہے۔ باب نسخ من اوٗصایا میں فرمایا ہے کہ "بعض اہل علم بالقرآن (مفسرین) کا فرمان ہے کہ والدین اور وارث اقربا کے حق میں وصیت کرنا منسوخ ہو گیا ۔اور غیر وارث اقربا کے حق میں وصیت کرنے میں اختلاف ہے

۔زیادہ تر اہل علم جن سے تکراز آتا ہے اور جن سے مجھ کو علم حاصل ہوا یہ فرماتے رہے کہ وصیت منسوخ ہو گئی۔ اس لئے کہ یہ حکم اس وقت تھا جب کہ وصیت کے ذریعے ہی ترکہ دیا جاتا تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے وراثت کا بذات خود تعین فرمادیا تو اب یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ جو کچھ ان حضرات نے کہا ہے، انشاء اللہ ایسا ہی ہے ۔ کچھ ہی آگے فرماتے ہیں " جن لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے وصیت کا حکم دیا تھا جب وہ آیت مواریث سے منسوخ ہو گئی اور سنت نے بھی اس کی تائید کی کہ وارث کے لِے وصیت جائز نہیں اور یہ بتادیا کہ وصیت غیر وارث کے لئے کی جاسکتی ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ورثاء کے لئے وصیت جائز نہیں اور یہ قوی طور پر ثابت ہوا کہ غیر وارث کے لئے وصیت ثابت ہے اور اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ والدین اور دوسرے ایسے قرابت دار جو کسی وقت وارث نہ ہوں تو ان کے حق میں بھی وصیت جائز ہو گی۔

جو آخری بات حضرت امامؒ نے کی ہے وہ ساری باتوں کا نچوڑ ہے اور اس میں تین فیصلے ہیں۔

1۔ وصیت وارث کے لئے جائز نہیں۔

2۔ غیر وارث کے لئے وصیت ثابت ہے۔

3۔ ایسے قرابت دار جو کسی وقت وارث نہ ہوں ان کے لئے وصیت جائز ہے۔

پس حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک غیر وارث کے لئے یا غیر وارث قرابت داروں کے لئے وصیت جائز تو ہے لیکن واجب نہیں۔

حنبلیہ۔ المختصر الخرقی کی کتاب الوصایا میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی تقریباً یہی دلائل منقول ہیں جو امام شافعیؒ کے ہیں۔

امامیہ۔ امامیہ کے نزدیک ورثاء کے لئے بھی وصیت جائز ہی البتہ اس کی انتہائی حد ایک ثلث ہی رہے گی (شرائع الاسلام علامہ حلی)

ایک اشتباہ

دار قطنی کی ایک روایت میں جس کو انھوں نے عمرو بن خارجۃ سے، ان کی اپنی سند کے ذریعہ روایت کیاہے یہ جملہ بھی آیاہے ' الا من الثلث ' یعنی وارث کے حق میں وصیت نہیں مگر یہ کہ ایک تہائی کے اندر ہو۔ پس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک تہائی کی حد تک وارث کے حق میں وصیت جائز ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ اتنے حصے میں ورثاء کی اجازت کی ضرورت نہیں، خواہ اجازت دیں یا نہ دیں، ایک تہائی کی حد تک وصیت جائز ہو گی۔ حالانکہ ورثاء کے حق میں بغیر اجازت ورثاء کسی مقدار کی وصیت جائز نہیں. اور جتنی روایات میں ' الا ان یشاء الورثہ ' ان تمام روایات سے اس جملہ کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت صرف اس وقت صحیح ہو گی جب کہ ورثاء اجازت دے دیں ورنہ نہ ہو گی۔

دراصل یہ الفاظ ' الا من الثلث ' صرف دار قطنیکی ایک روایت میں مذکور ہیں۔ باقی آئمہ حدیث کی روایات اس فقرہ سے خالی ہیں۔ دیگر روایات کے راویان اس روایت کے راوی قتادہ تک متحد ہیں۔ قتادہ سے نیچے کے راوی مختلف ہیں۔ قتادہ سے نیچے راوی سعید ہیں۔ چنانچہ حضرت قتادہ سے ان سعید کے ماسوا جتنے روایت کرنے والے ہیں ان میں سے کسی نے اس جملہ کو اپنی حدیث میں روایت نہیں کیاہے۔ چنانچہ ترمذی میں قتادہ سے ابو عوانہ نے روایت کیاہے۔ نسائی کی ایک سند میں بھی ابو عوانہ ہیں، دوسری سند میں شعبہ ہیں، تیسری میں اسمٰعیل بن ابی خالد ہیں، ان میں سے کوئی راوی قتادہ اور ان کے اعلی راویوں سے اس جملہ کی روایت نہیں کرتا۔ البتہ ابن ماجہ کی سند میں قتادہ سے نیچے رواى سعید بن ابی عروبہ موجود ہیں۔ لیکن اس حدیث میں بھی یہ جملہ موجود نہیں۔ بلکہ دوسری تفصیل آتی ہے۔چونکہدار قطنی نے اپنی سند میں محض ' سعید ' کہاہے، ان کی کوئی نسبت نہیں بیان کی۔ اس لئے معلوم نہیں کہ یہ کون سعید ہیں۔ اگر یہ وہی سعید ابن ابی عروبہ ہیں جن سے ابن ماجہ نے روایت کیاہے تو وہاں ان کی روایت میں یہ جملہ موجود نہیں۔ اور وہ سعید نہیں ہیں تو کون سے سعید ہیں، معلوم نہیں. بہر کیف یہ اضافہ دیگر کثیر روایتوں کے مقابلے میں منکر یاشاذیا معلول کے درجہ کاہے اور ناقابل قبول ہے نیز یہ کہ اگر یہ وہی سعید بن ابی عروبہ ہیں جن سے ابن ماجہ نے روایت کیاہے جس میں یہ جملہ موجود نہیں تو ابن ماجہ کی روایت دار قطنی کی روایت کے مقابلے میں مرجع ہے۔ اس لئے کہ ابن ماجہ نے راوی کو اس کی نسبت کے ساتھ واضح کر دیاہے۔ علاوہ ازیں دار قطنی کی اس سند کے مقابلے میں دیگر احادیث کی اسناد بھی قوی

ہیں۔ ان کے تمام راوی معروف و مشہور ہیں۔ اس لئے محض دار قطنی کا سعید سے مروی یہ اضافہ صرف نظر کر دیا جاِے گا

لب لباب۔

مفسرین کرام محدثین عظام اور فقہاعالی مقام میں سے اکثر کی تحقیق کے مطابق آیت ا آیات میراث ( سورۃ بقرۃ کے آیات نمبر 12، 11، 7اور 276) سے منسوخ ہو چکی ہے، بعض کے نزدیک آیات میراث سے ،بعض کے نزدیک سنت سے اور بعض کے نزدیک دونوں سے۔ بعض کے نزدیک یہ صرف ورثاء کے حق میں منسوخ ہوئی غیر وارث اقرباء کے حق میں یہ واجب ہے لیکن جمہور جس میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں ان کے نزدیک اس پر عمل اب نہیں رہا کیونکہ آیات میراث سے وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لئے وصیت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ اگر تفسیر روح المعانی میں فخر الاسلام کے بیان کردہ دو نکتوں پر غور کیا جائے تو اس کا پہلا نکتہ ان تمام مفسرین کی تائید کرتا ہے جنہوں نے تفسیر قرآن بالقرآن کے ذریعے اس آیت کی نسخ کا نظریہ اپنایا ہے اور دوسرا نقطہ اگر احادیث شریفہ کی فہم کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے تو جو اس آیت کے ذریعے غیر ورثاء اقربین کے لئے وصیت کے وجوب کے قائل ہیں ان کے بہت سے اشکالات کا جواب بھی ہو جائے گا یعنی اس مسئلے کے بارے میں مندرجہ بالا آیت کریمہ کتب علیکم اذا حضر الخ، من بعد وصیت یوصی بھا اؤ دین اور حدیث ان اللہ قد اعطیٰ کل ذی حق الخ کو علیحدہ علیحدہ دیکھنے کی بجائے ان کو ملا کر دیکھا جائے اور قرآن کے تدریجی انداز کو سامنے رکھا جائے تو مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا ہے۔ پس سب سے پہلے امت پر دور دراز کے تعلقات کی بنیاد پر وصیتیں کرنے کی بجائے والدین اور اقربین ( للوالدین و الاقربین ) کے لئے وصیت لازم کی گئی جیسا کہ تفسیر خازن نے لکھا ہے جس کا حوالہ گزر چکا۔ اس وصیت کے لئے طریقہ کار معروف کے بنیاد پر رکھا گیا۔ جیسا کہ ظاہر ہے معروف ہر جگہ کا الگ ہوتا ہے نیز اس میں حصص کا چونکہ باقاعدہ تعین نہیں کیا گیا تھا اسلئے ہر ایک کا جواب مختلف آسکتا تھا جس میں بعد میں مختلف قسم کی پریشانیاں پیش آسکتی تھیں اس امت کو چونکہ قیامت تک کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہے اس لئے ایسی کوئی بات جو بعد میں تردد کا باعث بن سکتی تھی اس کا تدارک کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے خود ہمارے لئے بہترین تقسیم کا اعلان کیا اس لئے اب گزشتہ حکم کے برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے اسی حکم کو اللہ تعالیٰ کی وصیت کے نام سے جاری کیا گیا۔ اگر لفظ وصیت پر غور کیا جائے تو اس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی وصیت ہی تو ہے جس کا اختیار پہلے ہمیں دیا گیا تھا لیکن اب اللہ تعالیٰ نے براہ راست اس تقسیم کا اعلان کیا جس کو پہلے ہمارے ذریعے سے کروانا چاہتا تھا۔ پس جیسا کہ محاورہ ہے جب پانی آجاتا ہے تو تیمم برخواست ہو جاتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی وصیت کے سامنے ہماری وصیت کالعدم ہو گئی اس کو صرف تلاوت اور اصول تدریج سمجھانے اور دوسری مصلحتوں جس کا ہمیں شاید علم نہ ہو باقی رکھا گیا لیکن عمل اب قانون میراث پر ہے۔ ولا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کی تلاوت کو برقرار رکھنے کی جو دلائل ہیں وہ یہاں بھی ہیں۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم سے کچھ پہلے للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون الخ کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ میراث میں حصّہ دار وہی ہیں جن کے لئے وصیت کرنے کا حکم دیا تھا یعنی والدین اور اقربین، فرق یہ ہے کہ وہاں ان کے حصوں کا تعین نہیں تھا یہاں تعین ہے۔ غور کی قابل بات یہ ہے کہ کتب علیکم اذا حضر الخ میں ال اس کے معرفہ ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خاص وصیت صرف اقرباء اور والدین کے لئے ہے اور للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون میں رجال کے ساتھ ال بھی معرفہ پر دلالت کر رہا ہے یعنی خاص مرد اور وہ کون ہے والد اور اقرباء اس طرح للنساء میں ال کا یہی کردار ہے پس جن خاص لوگوں کے لئے وصیت تھی ان کے لئے میراث کا حکم آگیا اب ان کے لئے وصیت کوئی نہیں۔ اس کے آیات کریمہ میں یوصی بھا اوٗ دین، توصون بھا اوٗ دین کا ذکر ہے جس میں وصیت بصورت نکرہ ہے پس یہ عام وصیت چونکہ پہلے وصیت سے مختلف ہے اس لئے اب یہ سب کے لئے ہونا چاہیئے لیکن جن لوگوں کو میراث دی گئی چونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے وصیت کا حکم تھا اس لئے بلاغت کا تقاضا یہ تھا کہ اس عام وصیت میں ان کو شامل نہ کیا جائے کیونکہ ان کے لئے یوصیکم اللہ کے عنوان سے خطاب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے اب انسانی وصیت کی جگہ خدائی وصیت نے لے لی لیکن شاید بعد میں کچھ لوگوں کو اختلاف اس وجہ سے ہو سکتا تھا اس لئے ان کے بارے میں سنت میں واضح حکم آگیا کہ ان کے بارے میں وصیت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کو اپنا حق بحکم خداوندی مل گیا ہے ااس کے لئے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وقت بھی بہترین منتخب فرمایا یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمادیا ان اللہ قد اعطیٰ لکل ذی حق حقہ فلا وصیت لوارث۔ اب حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مفسرین جن کو کتب علیکم کا زور نظر آرہا ہے جو وقتی تھا ان کو قد اعطیٰ لکل ذی حق کیوں نظر نہیں آیا اس کا مطلب یہی تو ہے کہ جتنے حق دار اللہ تعالیٰ

لازم بحکم واجب ہو اس لئے کسی کے لئے وصیت کے واجب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک من بعد توصون بھا اوٗ دین کا تعلق ہے تو چونکہ نہ یہ بصورت امر ہے اور نہ ہی کتب علیکم کے عنوان سے ہے نیز یہ بصورت نکرہ ہے اس لئے اس میں گو سب شامل ہو سکتے تھے وارث، غیر وارث اور کسی عارض کی وجہ سے محروم وارث مثلاً مورث کا قاتل غلام وغیرہ لیکن چونکہ وارثوں کے لئے وصیت کو منع کیا گیا ہے کیونکہ ان کے لئے انسانی وصیت کو الٰہی وصیت نے ختم کر دیا نیز حدیث شریف لا وصیۃ لوارث سے اسکی تصریح بھی ہو گئی اس لئے اس سے وصیت کا جواز ان تمام لوگوں کے حق میں جائز ثابت ہو گیا جو وارث نہیں۔ اس بحث سے الحمد للہ جمہور کی تحقیق بلا غبار ثابت ہو گئی شاید یہی وجہ ہے ابن کثیرؒ کو امام رازیؒ کی تفسیر پر تعجب ہوا۔ اس طریقہ استدلال سے ان شاء اللہ امام رازیؒ کے تمام اشکالات بھی جو جمہور کے استدلال پر تھے دور ہو سکتے ہیں کیونکہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ امام رازیؒ فلسفیانہ انداز میں ہر ہر جزو کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لے کر اس پر حکم لگاتے رہے شاید اس وقت کے فلسفے کا یہی اثر تھا آجکل کی جدید سائنس اس کی قائل ہے کہ ہر چیز کا علیحدہ علیحدہ( Local evaluation ) جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ سارے عوامل کا ایک مجموعی جائزہ(Global evaluation) بھی لینا ضروری ہے ورنہ نتیجہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ امام رازیؒ کے مقتدا امام شافعیؒ نے بھی اسی طریقے کو استعمال کرتے ہوئے جمہور کا ساتھ دیا کیونکہ امام شافعیؒ نے اپنی تحقیق کو اجماع کی روشنی میں قرآن و حدیث کے بغور مطالعے کے بعد مکمل کیا حالانکہ حضرتؒ کو اس کے لئے اپنے چند مسلمہ اصولوں پر چشم پوشی بھی کرنی پڑی۔ رہا ان کا مسئلہ کہ جو وارث کسی وجہ سے محروم ہیں ان کے لئے وصیت کرنا واجب ہے مثلاً قاتل باپ، غلام بیٹا وغیرہ۔ اس کے بارے میں جمہور کی یہ دلیل بہت وزنی ہے کہ ان کو محروم کرنے کی وجوہات اب بھی چونکہ باقی ہیں اس لئے اگر اس بنیاد پر ان کو میراث سے محروم کیا گیا تو وصیت ان کے حق میں کیسے باقی قرار دی جا سکتی ہے مثلاً قاتل کو اس لئے محروم کیا گیا ہے یہ کہ ورثاء مورثوں کو کہیں قتل نہ کرنا شروع کریں چونکہ وہ علت موجود ہے اس لئے ان کے لئے وصیت کرنا من بعد وصیۃ توصون بھا اوٗ دین کے مطابق زیادہ سے زیادہ جائز تو ہو سکتا ہے واجب نہیں کیونکہ اس طرح اگر وہ ایک طرف میراث سے محروم ہوتے ہیں تو دوسری طرف وصیت کے ذریعے ان کو لازمی حصّہ ملے گا جو کہ اس مقصد

کو فوت کرے گا جس کے لئے ان کے حصّے کو روکا گیا تھا۔ یہی دلیل غلام کے لئے بھی ہے کہ غلام کو دینے سے چونکہ مال اس کے مالک کو ملتا ہے جو اس کا اہل نہیں تو اس کو کیوں دیا جائے اس طرح اختلاف دین میں یہ علت کہ کافروں اور مسلمانوں میں وہ رشتہ باقی ہی نہیں رہتا جس کی وجہ سے وہ میراث میں حصّہ دار ہوتے ہیں گویا کہ وہ اقربین ہی نہیں رہتے تو اب ان کے لئے وصیت کرنے کا کیا مطلب۔

اگر اس حدیث شریف ان اللہ قد اعطیٰ کل ذی حق الخ کو قرآن کی آیات متعلقہ کی تفسیر کا ذریعہ سمجھا جائے تو وہ بحث ختم ہو جاتی ہے جو حدیث کی ناسخ قرآن کی حیثیت کے بارے میں ہے کیونکہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن کے سب سے پہلے مفسر ہیں۔ اصل میں اس آیت کی یہ بحث کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے یا نہیں یہ اصطلاحات کی بحث ہے اس کا اصل حکم پر اثر نہیں پڑتا یہی وجہ ہے کہ تمام فقہائے اربعہ کا نتیجہ ایک ہے حالانکہ ان میں ناسخ منسوخ کے قوانین کے لحاظ سے اختلافات ہیں۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ وصیت صرف جائز ہے یا مستحب تو اس میں بھی فقہاء کی دو رائے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ان آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ سے تو صرف اس کا جواز ثابت ہوتا ہے البتہ جو حضرات اس کو مستحب مانتے ہیں ان کی نظر ان احادیث شریف پر ہے جن میں اہل قرابت کے ساتھ احسان کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس لئے بعض صورتوں میں جائز اور بعض میں مستحب اس کی الگ ایک تفصیل ہے لیکن زیر نظر موضوع میں صرف جواز سے بھی ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اس لئے اس تفصیل کے دینے کا یہ موقع نہیں۔

بعض حضرات جو سورۃ نساء کی آیت و اذا حضر القسمۃ الخ سے اس حکم کا وجوب ثابت کرتے ہیں اس لئے غلطی پر ہیں کہ اس میں یتامیٰ کے ساتھ مساکین کا ذکر بھی آیا ہے کیا ان کے لئے بھی وصیت واجبہ کا قانون بنایا جا سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اس آیت کریمہ سے مستحق غیر وارث اقرباء کے لئے وصیت کے استحباب پر استدلال کیا ہے لیکن اس پر بھی اجماع نہیں ہو سکا۔

وصیت کی مقدار کے بارے میں یہ بات تو بالکل طے ہے کہ اس کی انتہائی حد ایک ثلث ہے جس کو زیادہ بتایا گیا پس اس سے کم کی وصیت پسندیدہ ہے جس کے حق میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے آثار پیش کئے جا سکتے ہیں

بعض حضرات کے نزدیک آیت میراث کی نزول سے اس میں جو وارث بنے ان کی حق میں تو وصیت ساکت ہوا لیکن باقی اقربا جو وارث نہیں یا کسی وجہ سے محروم ہوئے ان کے حق میں اب بھی واجب ہے اور دلیل میں ابن حزم کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

## ابن حزم کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ

الف۔ وصیت صاحب مال پر فرض ہے۔

ب۔ جس نے وصیت نہیں کی وہ گناہ گار ہے اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے صدقہ دینا چاہیئے

۔

ج۔ اس صدقے کی کم سے کم مقدار کی کوئی حد نہیں لیکن زیادہ سے زیادہ ایک ثلث ہو سکتی ہے

۔

د۔ جن اقربا کی حق میں وصیت فرض ہے وہ میت کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ وارث کی حق میں وصیت ممنوع ہے پس اگر کوئی وارث بنتا ہے چاہے کتنا ہی قلیل حصّہ پا رہا ہو اس کے لئے وصیت ممنوع ہے۔

ابن حزمؒ کے اخلاص پر کوئی شک نہیں لیکن جہاں تک ان کی اس تحقیق کا تعلق ہے تو جمہور کی تحقیق کے مقابلے میں ان کی تحقیق زیادہ قابل تقلید نہیں ہے کیونکہ ان کے دلائل ایسے نہیں کہ ان کے مقابلے میں جمہور کے دلائل کی حیثیت بالکل مجروح ثابت ہو۔ اگر اجتہادی تحقیق ہی لینی ہو تو مذاہب اربعہ کے اندر اندر زیادہ معتبر ہے کیونکہ ابن حزمؒ کے مقلد آجکل نہیں ہیں اور یہ قانون بنایا جارہا ہے ان کے لئے جو یا تو مذاہب اربعہ کے مقلد ہیں یا پھر سرے سے مقلد ہی نہیں۔ جو مقلد نہیں ان کے لئے ابن حزمؒ کی تقلید ایسے ہی خلاف اصول ہوگی جیسے کہ مذاہب اربعہ میں کسی کی تقلید پھر غیر مقلدین کی تعداد مذاہب اربعہ کے مقلدین کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اہل عرب کے مسلک جمہور والوں کو ان میں شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ تو جمہور کے ماننے والے ہیں اور مسلک جمہور فقہاء کی اکثریت کے اتباع کو کہتے ہیں جو اس مسئلے میں مذاہب اربعہ کا اتباع ہے پس کسی طرح بھی ابن حزمؒ کی یہ شاذ رائے لائق سماعت نہیں اور پرسنل لاء کا بنیادی سپرٹ قانون سازی میں ان لوگوں کی مسلک کے احترام پر مبنی ہے جن پر اس قانون کو لاگو کیا جائے گا ورنہ پبلک لاء اور پرسنل لاء میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ آیت کریمہ کی تفسیر سے متعلق اس پر جو بحث ہے وہ پیش کی گئی ہے اس کے مقابلے میں ابن

حزم کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ جہاں تک بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ابن حزم مجتہد مطلق تھے تو نہ انہوں نے اس کا خود دعویٰ کیا تھا کیونکہ وہ اس کے قائل ہی نہ تھے اور نہ ہی اس کو کسی طائفہ نے مجتہد مطلق تسلیم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقلید کے تو وہ خود ہی قائل نہیں تھے اس لئے مقلدین اس کا کیوں اتباع کرتے اور غیر مقلدین اس میں تو ان کے مقلد تھے کہ تقلید نہیں کر رہے تھے لیکن باقی امور میں اس کی کیوں تقلید کریں کہ وہ تقلید کے قائل ہی نہیں اس لئے ابن حزم کی رائے صرف ایک رائے ہی ہے اور بقول علامہ کوثریؒ جو ترکی کے آخری نائب شیخ الاسلام تھے ان کی اختلاف سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مشہور محقق حضرت العلامہ ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن کی اٹھارویں جلد کے باب الوصایا میں واضح طور پر فرماتے ہیں کہ وصیت اب واجب نہیں رہی ہے بلکہ ایک ثلث کے اندر اندر صرف جائز ہے جس پر حضرت علماء کرام کا اجماع بتاتے ہیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

مختلف زمانوں اور شہروں کی علماء کرام کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ وصیت واجب نہیں اگر ہے تو صرف ان پر جن پر کسی کا قرض ہو یا اس کے پاس کسی کی امانت ہو یا اس پر کسی اور سبب سے کوئی چیز واجب ہو کہ وہ صرف وصیت ہی کے ذریعے اس کو پورا کر سکتا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانتوں کی ادائیگی کا حکم دیا ہے اور اس کا طریقہ اس باب میں یہ ہے کہ واجمع العلماء فی جمیع الامصار والاعصار علیٰ جواز الوصیۃ، ولا تجب الوصیۃ الا علیٰ من علیہ دین، اوْعندہ ودیعۃ، اوْعلیہ واجب، یوصی بالخروج منہ؛ فان اللہ تعالی فرض اداء الامانات، وطریقہ فی ھٰذا الباب

کہ وہ اس کی وصیت کرے پس ایسی وصیت اس پر فرض ہے اور یہی وہ موقعہ ہے جس کے بارے میں امام مالک نافعؒ سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مؤمن کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے لئے وصیت کرنی لازم ہو کہ وہ دو راتیں ایسی گزاریں مگر یہ کہ اس نے اس کے بارے میں وصیت لکھی رکھی ہو۔ (متفق علیہ)

پس وصیت اپنے مال میں سے کرنا جمہور میں سے کسی کے قول کے مطابق بھی واجب نہیں ہے اور یہی رائے شعبی، نخعی، ثوری، مالک اور ابو حنیفہ، شافعی اور اس کے اصحاب وغیر ھم کی رائے ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ وصیت واجب نہیں مگر صرف ان پر جن پر کسی کے حقوق بغیر شھادت

کے باقی ہوں یا بغیر شہادت کی امانت ہو۔ اس اجماع کے مقابلے میں ایک قلیل جماعت کی یہ شاذ رائے ہے۔ ان کے نزدیک غیر وارث رشتہ داروں کے لئے وصیت واجب ہے یہ داؤد، مسروق، طاؤس، ایاس، قتادہ اور ابن جریر کی رائے ہے جنہوں نے آیت کریمہ اور ابن عمرؓ کی خبر سے دلیل پکڑی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ وارث اقرباء کے حق میں آیت وصیت منسوخ ہے جبکہ غیر وارث اقرباء کے حق میں یہ باقی ہے جبکہ ہمارے نزدیک صحابہؓ سے اس قسم کی وصیت منقول نہیں اور نہ ہی اس پر نکیر ثابت ہے حالانکہ اگر یہ واجب ہوتا تو صحابہ اس سے خالی نہ ہوتے اور ان سے نقل ظاہراً نقل مراد ہے اور یہ کہ کسی کو کوئی چیز بخشنا جیسا کہ حیات میں واجب نہیں اس طرح موت کے بعد بھی نہیں۔ جہاں تک آیت کا تعلق ہے تو حضرت ابن عباسؓ کے یہ للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون سے منسوخ ہے اور ابن عمرؓ اس کو آیت میراث سے منسوخ مانتے ہیں اور یہی رائے عکرمہ، مجاہد، مالک اور شافعی کا ہے اور ابن عمرؓ کا حدیث اس پر محمول ہے کہ کسی پر (کسی اور وجہ سے) وصیت واجب ہو یا اس کے پاس کسی کی امانت ہو جیسا کہ المغنی میں ہے اور یہ بھی ابن عمر کی حدیث میں ' ماحق امرأ مسلم لہ شئ یوصی فیہ ' اس کی وجوب پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ حق لغت میں الشئ الثابت کو کہتے ہیں اور شرعاً اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کہ جس سے حکم ثابت ہوتا ہے اور حکم عام ہے چاہے واجب ہو یا مستحب ہو اور مباح پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے الخ۔ آگے لکھتے ہیں کہ ابن حزم جو اس سے وجوب پر استدلال کرتے ہیں ایک دعویٰ مجردہ ہی ہے اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ لہ شئ یرید ان یوصی فیہ ( رواہ أیوب عن نافع، ورواہ عبید اللہ بن عمر عن نافع مثلہ، اخرجھما مسلم ) سے اس کا استحباب ہی ثابت ہوتا ہے اور اس روایت کے بارے میں جس میں ' لایحل ' کے الفاظ سے بات کی گئی ہے تو فتح الباری کے مطابق اس کا احتمال پیش نظر رکھا جاسکتا ہے کہ راوی نے اسکو بالمعنی ذکر کیا ہو جس سے اس کا ارادہ عدم جواز کا ثبوت فراہم کرنا ہو جس میں وجوب مندوب اور مباح سب کا امکان ہوتا ہے

۔

پس پہلے سوال کا جواب اب مختصراً یہ ہے اوصیت واجب نہیں بلکہ صرف جائز ہے اور بعض صورتوں میں مستحسن ہے کیونکہ بندہ کی رائے میں اس آیت کو منسوخ نہ بھی سمجھا جائے اور یوصیکم اللہ فی اولادکم۔۔۔ کو

نہیں پڑتا کیونکہ اگر اس کو منسوخ سمجھا جائے تب تو اس پر عمل نہیں ہوگا اور اگر اس کو منسوخ نہ بھی سمجھا جائے تب بھی اس پر عمل آیات میراث پر عمل کی شکل میں ہوگا۔

دوسرے سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ مستحب کا التزام اگر واجب کی طرح ہونے لگے تو اس کا بعض اوقات بغرض تعلیم ترک واجب ہو جاتا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے

(بخاری 339)

ترجمہ۔ حضرت محمد بن المنکدر تابعیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے ہمارے ساتھ تہبند میں نماز پڑھی جس کو انہوں نے گردن کی طرف باندھ رکھا تھا اور ان کے کپڑے تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا آپ صرف تہبند میں نماز پڑھتے ہیں؟ جابرؓ نے فرمایا یہ میں نے اس لئے کیا کہ تم جیسے احمق کو بتادوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وقت

کس شخص کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟

اس طرح علمائے کرام فرماتے ہیں کہ امور مباحہ و مستحبہ اصرار و التزام سے بدعت ہو جاتے ہیں۔ اس کا اصل الاصول تو یہ ہیکہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم الخ کے بعد دین کا جو مزاج تواتر سے ثابت ہو اس کو بدلنا معیوب ہے کیونکہ اس سے دین کا ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے چنانچہ بخاری شریف کی ایک روایت ہے

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی شخص ہمیشہ داہنی طرف مڑ کر اپنی نماز میں شیطان کا حصّہ نہ بنائے میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھتا تھا کہ آپ بہت دفعہ بائیں طرف بھی مڑا کرتے تھے۔

سوال نمبر 3 کا جواب نفی میں ہے کیونکہ مستحب کو اگر کوئی واجب نہیں کر سکتا تو جس چیز کا کسی کو اختیار ہی نہیں ہو وہ کیسے اس کو واجب کر کے نافذ کر سکتا ہے؟ جسکا حق تھا اس نے اگر اسکو استعمال نہیں کیا تو اب اپنی طرف سے یہ فرض کرنا کہ اس نے وصیت کی ہے وہ پورے نظام وصیت کو سبوتاژ ( Sabotaj ) کرنے کے مترادف ہے۔ فقہ کا عام قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی چیز جو پہلے نہیں تھی اس کا ہونا ثابت نہ ہو جائے تو اس پر نفی کے احکام وارد ہوں گے۔ نکاح طلاق بیع و شراء پاکی ناپاکی میں اس پر عمل ہوتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں کے درمیان نکاح کا نہ ہونا ثابت نہ کیا گیا تو یہ فرض کیا جائے گا کہ ان کا آپس میں نکاح ہوا ہے اس

لئے اس فلاں کے ذمے فلاں کے وہ تمام حقوق ثابت ہوگئے جو نکاحسے ثابت ہوتے ہیں ظاہر ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتااس لئے وصیت واجبہ کی اصطلاح کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔

سوال نمبر 4 کا جواب ہاں میں ہے۔اگر میت کی بیٹیاں ہوں لیکن بیٹے نہ ہو اس کے دو بھائی زندہ ہوں اور ایک بھائی اس کی موت سے پہلے مر چکا ہو تو میت کے ان بھتیجوں بھانجوں کی جو اس کے مرحوم بھائی بہن کی اولاد ہیں بالکل وہی حیثیت ہوگی جو میت کی محروم اولاد کی ہوتی اس لئے اگر محرومیت کی وجہ سے میت کی محروم اولاد پر ترس کھا کر ان کے لئے وصیت واجبہ کی اصطلاح ہو سکتی ہے تو کل کلاں بھتیجوں بھانجوں کے لئے اس اصطلاح کو بنانا پڑے گا اور ایک ایسا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کے لئے قانون سازی کرنا عملاً کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوگا۔اگر کوئی اذا حضر القسمۃ۔۔۔سے استدلال کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کو کہا جائے گا کہ اس آیت شریفہ میں اولو القربیٰ کے ساتھ دیگر یتامیٰ اور مساکین کا بھی ذکر ہے اس لئے پھر ان کے لئے بھی وصیت واجبہ کا قانون بھی بنایا جائے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کو چھیڑنے سے بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں تو اللہ جل شانہ کے بنائے ہوئے قانون کو چھیڑنے سے کس قدر مسائل پیدا ہوں گے اس کا ادراک بہت مشکل ہے۔

لہٰذا شریعت مطہرہ کے قوانین کو ان کی اصلی ہیئت پر ہی رہنے دیا جائے۔سوال نمبر 5 کا جواب ان حضرات کے ذمّہ ہے جو وصیت واجبہ کا قانون بنوانا چاہتے ہیں ہمارا مدعا تو یہی ہے کہ خیر القرون سے لے کر اب تک اگر یہ قانون نہیں بنایا گیا تو آئندہ بھی شرعی ضابطے کی پابندی کرتے ہوئے نہ بنایا جائے۔اگر شام مصر کے قانون سے استدلال کیا جائے تو جواب واضح ہے کہ یہ قانون انہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے نہیں بنایا بلکہ سیکولر ازم سے متاثر ہو کر اسلام کے خوبصورت مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگایا ہے۔بقول پیر کرم شاہ الازھری مرحوم جو وہاں کے رمز آشنا تھے اپنی کتاب سنت خیر الانام میں لکھتے ہیں " بعض لوگ اس بات سے کہ یورپ اور امریکا میں میراث کی بجائے وصیت پر عمل ہے احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنے قانون کو بھی اس سے آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔"

اب سوال یہ ہے کہ پھر یتیموں اور بے آسرا اقرباء کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے؟ تو اس کے لئے عرض

کرنے پر وعید بھی آئی ہے لیکن وہ قانونی شکل میں نہیں بلکہ ترغیبی شکل میں ہے۔ ہم نہ تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ حکیم ہیں اور نہ مہربان۔ نہ ہی ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے زیادہ منشاء الٰہی کے جاننے والے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر تو براہ راست وحی آتی تھی اور صحابہؓ کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پوری زندگی تھی اس لئے ہمیں قرآن وسنت کے حکم جب موجود ہو تو کسی اجتہاد کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ شیخ ابوزھرہ نے جو تجویز اس سلسلے میں دی ہے وہ اسی قسم کا اجتہاد ہے۔ یہ نہ صرف قرآن، سنت اور اجماع سے متصادم ہے بلکہ کسی مدون فقہ کے مطابق بھی نہیں۔ اس پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ وصیت واجبہ کا قانون وصیت کے نام پر ایک جدید نظام میراث ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ اس کو سٹیٹ کی طرف سے مقرر کر کے نافذ کیا جاتا ہے اور اس میں وصیت کنندہ کی رائے لینے کا تکلف گوارا نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف یہ نظر انداز کیا جاتا ہے کہ میراث سے محروم ہونے والے صرف پوتے پوتیاں نہیں بلکہ اور رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں۔ ان چودہ صدیوں میں کسی اسلامی مملکت کو وصیت واجبہ کی قانون کی ضرورت نہیں پڑی اس لئے یہ ایک قسم کا قانونی تواتر ہے۔ اس لحاظ سے وصیت واجبہ کی تو کوئی گنجائش نہیں دوسرا حل اس کا یہ ہے کہ اس کا فیصلہ جمہور کے فیصلے کے مطابق کیا جائے جس کی ایک عقلی دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ عدالت میں بھی اگر متفقہ فیصلہ نہ ہو سکے تو اکثریتی فیصلہ بھی قابل قبول ہوتا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ یا تو اس قانون سے متاثر لوگوں کو دیکھا جائے کہ ان میں اکثریت کونسی فقہ سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر فقہاء کی اکثریت کو دیکھا جائے کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔ اس مسئلے میں ہماری خوش قسمتی ہے کہ دونوں صورتوں میں جواب ایک ہی آتا ہے کیونکہ ملک کی اکثر لوگوں کی فقہ حنفی ہے جن کی رائے جمہور کے مطابق بھی ہے اس لئے شاذ رائے کو چھوڑ کر جمہور کے فیصلے کو اپنایا جائے کیونکہ فقہاء کے ہاں مشہور محاورہ ہے من اتبع شواذ قوم فقد ضل اس لئے شاذ کا اتباع کرنے سے بچنے میں ہی بہتری ہے۔ اس تجویز کی روشنی میں عدالت سے درخواست ہے کہ:

-1 جیسا کہ عدالت عالیہ پشاور کے شریعت بنچ نے جسٹس عبدالحکیم صاحب کی سربراہی میں فیصلہ دیا کہ ' ہماری رائے میں مسلم فیملی لاء کا سیکشن نمبر 4 خلاف شریعت ہے اس لئے اس کو ختم کیا جائے' ( PLD 1980 Pesh ;78)

-2مذکورہ بالا بنچ نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ یتیم پوتا صلعی کونسل کی وساطت سے یہ درخواست خود یا کسی کی ذریعے سے پیش کرے کہ اس کے دادا کو یہ کہا جائے کہ وہ ان کی حق میں وصیت کرے( PLD 1980 Pesh ;78)۔ یہ ایک مناسب تجویز ہے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی جائے بلکہ اس میں مزید انتظامی آسانیاں پیدا کرنے کی سفارش کی جائے مثلاً مقامی انتظامی مشینری اس صورت میں شہر کے بزرگوں کی وساطت سے دادا کو ترغیب دینے کا اہتمام کرے کہ وہ اپنے محروم پوتوں پوتیوں کے لئے یا تو خود وصیت کرے یا ان کو اپنی زندگی میں مناسب مال ھبہ کرے اور اس پر ان کو قبضہ بھی دلوائے اور انتظامیہ ان کی مدد کے لئے طریقہ کار کو سستا اور آسان بنائے۔

-3نفقہ اقارب کے ضمن میں یتیم بچوں کے نفقہ کو ان کے قریب ترین رشتہ داروں پر لازم کرایا جائے جن میں سب سے پہلے دادا اور اس کی وفات کی صورت میں چچاؤں کا نمبر آتا ہے۔ اگر اس میں نا قابل حل مشکل در پیش ہو تو سٹیٹ ان کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائے۔

اس کے علاوہ عدالت عالیہ شرعیہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ عائلی قوانین کے تمام شقوں کو شریعت کے مطابق کرنے کی سفارش کے ساتھ ساتھ اس کی بھی سفارش کی جائے کہ ملک میں شرعی قوانین کی روشنی میں دولت کی منصفانہ تقسیم کا نظام مرتب کرکے اس کو نافذ کیا جائے کیونکہ اسی کی کمی سے سیکشن نمبر4 کے بنانے کی کوشش کی گئی جو کامیاب ہوئی جو کہ ایک غلطی کو ختم کرنے کے لئے اس سے بڑی غلطی کرنے کے مترادف ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنك رحمة انك انت الوھاب۔